حضرات صحابہؓ پر کیے جانے والے

اعتراضات کے جوابات

ازافادات:

- علامہ شبلی نعمانیؒ
- مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
- مولانا محمد منظور نعمانیؒ
- شیخ یوسف القرضاوی
- مولانا محمد تقی عثمانی

ترتیب: فضل الرحیم الہ آبادی

فہرست

عرض مرتب

تاریخ اسلامی کا سب سے بڑا المیہ وہ سبائی پروپیگنڈہ ہے جس نے اسلام اور اس کی مقدس ترین نسل (صحابہؓ) کی تصویر مسخ کرنے کی نہایت خطرناک کوششیں کیں، اور امت کا امتحان کہ وہ اپنی اس کوشش میں بہت بڑی حد تک کامیاب رہا، پروپیگنڈہ کی شدت اور کامیابی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ سیدنا علیؓ کو اپنی حیات طیبہ میں ہی بار بار یہ وضاحت کرنی پڑتی تھی کہ رسول اکرم (ﷺ) نے ان کو کوئی ایسا مخصوص اور مخفی علم نہیں دیا ہے جس سے دیگر صحابہ ناواقف ہوں، اور ان کے پاس کوئی ایسا مخفی صحیفہ نہیں ہے جس میں لکھی گئیں دینی تعلیمات سے بقیہ حضرات ناآشنا ہوں۔ یہ درحقیقت ان سبائیوں ہی کے پروپیگنڈہ کی تردید تھی جنہوں نے حضرت علیؓ اور ان کے خانوادے سے اظہار محبت کی آڑ میں دین حنیف کو مسخ کرنے کی کوشش کی تھی، اور امت کی بڑی تعداد کے دین وایمان کو نقصان پہنچایا تھا۔

اس سبائی پروپیگنڈہ کا بڑا حصہ حضرات صحابۂ کرام کے خلاف جھوٹی تہمتوں پر بھی مشتمل تھا، جس کے نشانہ پر سابقین اولین بھی تھے، اور جس کا منشا امت کو دین کے اولین ناقلین سے ایسا بدگمان کر دینا تھا کہ اس کے بعد امت کو اس مقدس نسل اور اس کے نقل کردہ دین پر اعتماد نہ رہے، اور اس کے دین وایمان کا بھی وہی حشر ہو جائے جو ایک یہودی سنٹ پال کے ہاتھوں عیسائیت کا ہو چکا تھا، یہ سازشیں دین وایمان کے لیے کیسی خطرناک تھیں اس کا اندازہ ان پروپیگنڈوں کو قبول کر لینے والے اہل تشیع اور ان کے دین ومذہب کو دیکھ کر بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

اللہ کا احسان کہ اس نے امت کے سواد اعظم کی اس فتنہ سے حفاظت فرمائی اور اس کا دین وایمان

اس کے شر سے محفوظ رہا، لیکن دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ اہل سنت کے کچھ افراد اور حلقوں میں بھی اس فتنہ کے کچھ اثرات نظر آتے رہے ہیں، اللہ ہر عہد کے ان ائمہ وعلما کو جزائے خیر عطا فرمائے جنہوں نے اس طرح کی غلط فہمیوں کی تردید کی اور امت کے نظریات وعقائد کو بگڑنے سے بچایا۔

زیر نظر کتابچہ درحقیقت بعض حضرات کے یہاں صحابہ کرام کی بابت پائے جانے والی چند غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کے جوابات پر ہی مشتمل ہے، اس میں ہم نے منتخب اہل علم وتحقیق شخصیات کی کچھ ایسی تحریریں جمع کی ہیں جن میں ان غلط فہمیوں اور دعووں کی نہایت گہری علمی تردید کی گئی ہے، امید ہے کہ قارئین کے لیے یہ کتابچہ مفید ثابت ہوگا، تاریخ اسلامی کے مطالعہ کے وقت جو چند گرہیں انسان کے ذہن میں پڑتی ہیں یا بعض حضرات کے ذریعہ ڈالی جاتی ہیں، امید ہے کہ چند صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ ان گرہوں کو کھولنے میں معاون ہوگا۔

آخری کلمہ اللہ کی حمد وثنا ہے، کہ اس کتابچہ کی ترتیب درحقیقت اسی کی توفیق کا ثمرہ ہے۔

فضل الرحیم الہ آبادی

واقعۂ قرطاس

مولانا محمد منظور نعمانی

عن ابن عباس قال لما حضر رسول الله صلی الله علیه وسلم وفی البیت رجالٌ فیهم عمر بن الخطاب قال النبی صلی الله علیه وسلم هلمُّوا اکتب لکم کتاباً لن تضلوا بعده فقال عمر غلبه الوجع وعند کم القراٰن حسبکم کتابُ اللهِ فاختلف اهل البیت واختصموا فمنهم من یقول قربوا یکتُنبُ لکم رسول الله صلی الله علیه وسلم ومنهم من یقولُ ما قال عمر فلمّا اکثروا اللَّغط والاختلاف قال رسول الله صلی الله علیه وسلم قوموا عنی .... قال عبیدالله فکان ابن عباس یقول ان الرّزیّة کل الرزیّة ما حال بین رسو ل الله صلی الله علیه وسلم وبین اَنْ یکتب لهم ذالک الکتاب لاختلافهم ولغطهم .... (رواه البخاری و مسلم)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے بیان کیا کہ (ایک دن) جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب آ گیا تھا، اور (حضورؐ کے پاس) گھر میں چند اشخاص تھے، جن میں ایک حضرت عمر بن الخطابؓ بھی تھے، آپؐ نے فرمایا: آؤ میں لکھدوں (یعنی لکھادو) تمہارے لئے ایک نوشتہ کہ ہرگز گمراہ نہ ہوگے تم اس کے بعد.......تو کہا حضرت عمرؓ نے (لوگوں سے) کہ حضورؐ کو اس وقت سخت تکلیف ہے، اور تمہارے پاس قرآن موجود ہے، اور وہ اللہ کی کتاب تمہارے لئے (یعنی تمہاری ہدایت کے لئے اور گمراہی سے حفاظت کیلئے) کافی ہے، پس جو لوگ اُس وقت

(حضورؐ کے پاس) گھر میں تھے، ان کی رائیں مختلف ہوگئیں، اور وہ آپس میں بحث کرنے لگے، ان میں سے کچھ کہتے تھے کہ (لکھنے کا سامان) آپؐ کے پاس لے آؤ تا کہ آپؐ وہ لکھا دیں (جو لکھانا چاہتے ہیں)، اور بعض وہ کہتے تھے جو حضرت عمرؓ نے کہا تھا، تو جب (اس بحث ومباحثہ کی وجہ سے) اختلاف اور شوروشغب زیادہ ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ میرے پاس سے چلے جاؤ۔

(حضرت ابن عباس سے اس واقعہ کے روایت کرنے والے راوی) عبیداللہ بن عبداللہ بیان کرتے ہیں کہ ابن عباس اس واقعہ کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ مصیبت ساری مصیبت وہ ہے جو حائل ہوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان اور اس نوشتہ کی کتابت کے درمیان (جو آپؐ لکھانا چاہتے تھے) ان لوگوں کے باہمی اختلاف رائے اور شوروشغب کی وجہ سے ۔۔۔۔(صحیح بخاری وصحیح مسلم)

جیسا کہ ذکر کیا گیا حضرت عبداللہ بن عباس سے اس واقعہ کی یہ روایت عبیداللہ بن عبداللہ کی ہے، حضرت ابن عباس کے ایک دوسرے شاگرد سعید بن جبیر نے بھی ان سے اس واقعہ کی روایت کی ہے، اس میں چند باتوں کا اضافہ ہے، وہ روایت بھی صحیحین ہی میں ہے، اس کو بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے تا کہ پورا واقعہ سامنے آجائے۔.......سعید بن جبیر راوی ہیں:

قال ابن عباس: یوم الخمیس وما یوم الخمیس؟ثم بکیٰ حتی بل دمعه الحصی، قلت یا ابن عباس وما یوم الخمیس؟ قال اشتدّ برسول الله صلی الله علیه وسلم وجُعهٔ، فقال ائتونی بکتف اکتب لکم کتاباً لا تضلّوبعده ابداً افتنازعوا ولا ینبغی عندَ نبی تنازع فقالوا ماشأنهٔ اهجراستفهموهُ فذهبوا یردُّوْنَ علیه فال دعونی ذرولی فالّذی انا فیه خیر مما تدعوننی الیه فامرهم بثلث فقال اخرجوالمشرکین من جزیرة العرب و اجیزوالوفد بنحو ماکنت اجیز هم وسکت عن الثالثة او قالها فنسیتها ....

قال سفیان ھذا من قول سلیمان---- (رواہ البخاری و مسلم)

(سعید ابن جبیر بیان کرتے ہیں کہ ایک دن) حضرت ابن عباس نے کہا کہ (ہائے) جمعرات کا دن، اور کیسا تھا جمعرات کا وہ دن (یہ کہہ کر) وہ ایسے روئے کہ ان کے آنسوؤں سے فرش زمین کے سنگریزے تر ہوگئے ۔ میں نے عرض کیا کہ اے ابن عباس کیا تھا وہ جمعرات کا دن؟ (جس کو آپ اس طرح یاد کررہے ہیں) تو انھوں نے بیان کیا کہ (جمعرات کا دن تھا) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری بڑھ گئی تو (اسی حالت میں) آپ نے فرمایا کہ 'کتف ' (شانہ کی ہڈی) لے آؤ میں تمہارے لئے ایک تحریر لکھا دوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے،تو اس معاملہ میں (ان لوگوں میں جو اس وقت آپؐ کے پاس حاضر تھے) اختلاف رائے ہوگیا..........اور نبی کے پاس تنازع اور اختلاف نہ ہونا چاہئے۔ بعض لوگوں نے کہا کہ کیا آپؐ ہم کو چھوڑ رہے ہیں (داغ مفارقت دے رہے ہیں) آپ سے دریافت کرو (کیا فرماتے ہیں اور کیا عرض ہے؟) پھر لوگ آپؐ سے بار بار اس بارے میں عرض کرنے لگے تو آپؐ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو، میں جس شغل اور جس حال میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو.........پھر آپؐ نے تین باتوں کا حکم فرمایا ایک یہ کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے باہر کر دیا جائے ، اور (حکومتوں یا قبیلوں کی طرف آنے والے) وفود یا قاصدوں کے ساتھ اسی طرح کا حسن سلوک کیا جائے جس طرح کا میں کیا کرتا تھا.........سعید بن جبیر سے اس حدیث کے روایت کرنے والے راوی سلیمان کہتے ہیں کہ سعید بن جبیر نے یا تو تیسری بات بیان ہی نہیں کی یا میں بھول گیا .... (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

(تشریح) ایک ہی واقعہ سے متعلق حضرت عبداللہ ابن عباس کے یہ دو بیان ہیں، ان میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں ہے،صرف بعض اجزاء کی کمی زیادتی کا فرق ہے، بظاہر اس کا سبب یہ ہے کہ جب حضرت ابن عباس نے یہ واقعہ عبیداللہ بن عبداللہ کے سامنے بیان کیا تو صرف وہ اجزا بیان کئے جو پہلی

روایت میں ذکر کئے گئے ہیں، اوراس وقت حضورؐ کے پاس حضرت عمرؓ کا ہونا اورانھوں نے جوفرمایا تھااس کا بھی ذکر کیا، اور جب سعید بن جبیر کے سامنے بیان کیا تواس میں حضرت عمرؓ کا تو کوئی ذکر نہیں کیا لیکن کئی باتیں وہ بیان کیں جو پہلے بیان میں ذکر نہیں کی تھیں.........اور ایسا بکثرت ہوتا ہے۔

دونوں روایتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو پورا واقعہ اس طرح سامنے آتا ہے کہ جمعرات کا دن تھا، (یعنی وفات سے پانچ دن پہلے، کیونکہ یہ بات قطعی اور یقینی طور پر معلوم ہے کہ حضورؐ کی وفات دوشنبہ کو ہوئی) تو اس جمعرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض میں شدت ہوگئی، بخار بہت تیز ہوگیا اور تکلیف بہت بڑھ گئی، اس وقت آپؐ کے پاس چند حضرات تھے ان میں حضرت عمرؓ بھی تھے، اسی حالت میں حضورؐ نے فرمایا کہ لکھنے کا سامان لے آؤ، میں چاہتا ہوں کہ تمہارے لئے ایک تحریر لکھوادوں، جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے (صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے ''ایتونی بالکتف والدّواۃِ ''یعنی شانہ کی ہڈی اور دوات لے آؤ[1]، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہا کہ اس وقت حضورؐ کو بہت تکلیف ہے، آپؐ ہی کے ذریعہ آیا ہوا قرآن مجید تمہارے پاس موجود ہے، ہماری تمہاری ہدایت کے لئے اور ہر طرح کی ضلالت اور گمراہی سے بچانے کے لئے اللہ کی وہ کتاب کافی ہے (جیسا کہ خود قرآن میں بارہا فرمایا گیا ہے) حاضرین میں اس بارے میں اختلاف رائے ہوگیا، کچھ حضرات نے کہا کہ لکھنے کا سامان لانا چاہئے تاکہ حضورؐ جو لکھوانا چاہتے ہیں وہ لکھا جائے، اور کچھ حضرات نے وہ کہا جو حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ اس سخت تکلیف کی حالت میں حضورؐ کو کچھ لکھوانے کی زحمت نہ دی جائے، اللہ تعالیٰ کی کتاب ہدایت قرآن مجید کافی ہے۔اسی موقع پر بعض حضرات نے کہا ''مَاشَانُہٗ؟ اَھَجَرَ؟ اِسۡتَفۡھِمُوۡہ '' (حضورؐ کا کیا حال ہے، کیا آپؐ جدائی اختیار فرمارہے ہیں ہم کو چھوڑ کر جارہے

---

[1] ملحوظ رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں خاص تر حجاز میں کاغذ بہت کم دستیاب ہوتا تھا، اس وجہ سے جب کچھ لکھنا ہوتا تو مختلف چیزوں پر لکھا جاتا تھا، ان میں سے ایک جانور کے شانہ کی ہڈی بھی تھی، اس پر اسی طرح لکھا جاتا تھا جس طرح لکڑی یا پتھر کی تختی پر لکھا جاتا ہے۔

ہیں؟ آپ سے دریافت کرو) پھر لوگ اس بارے میں بار بار آپ سے عرض کرتے رہے، اس سے آپ کی توجہ الی اللہ اور اس وقت کی خاص قلبی کیفیت میں خلل پڑا، آپ نے فرمایا اس وقت تم لوگ مجھے چھوڑ دو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہ کرو میں جس شغل اور جس حال میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو (یعنی میں اس وقت اپنے رب کریم کی طرف متوجہ ہوں اس کے حضور میں حاضر ہونے کی تیاری کر رہا ہوں اور تم مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو مجھے چھوڑ دو)............

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں (کہ اس کے بعد آپ نے اسی مجلس میں تین باتوں کا حکم فرمایا۔ ایک یہ کہ مشرکین کو جزیرۂ عرب سے باہر کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ حکومتوں یا قبیلوں کی طرف سے آنے والے وفود اور قاصدوں کے ساتھ اسی طرح حسن سلوک کیا جائے (ان کو مناسب تحائف دئے جائیں) جیسا کہ میرا طرز عمل رہا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کے روایت کرنے والے سعید بن جبیر کے شاگرد سلیمان نے تین باتوں میں سے یہی دو باتیں بیان کیں، اور تیسری بات کے بارے میں کہا کہ یا تو سعید بن جبیر نے وہ بیان ہی نہیں کی تھی یا میں بھول گیا ہوں۔

یہ ہے پورا واقعہ جو ''حدیث قرطاس'' کے نام سے معروف ہے، اس میں چند باتیں خاص طور سے قابلِ لحاظ اور وضاحت طلب ہیں۔

ایک یہ کہ یہ واقعہ جمعرات کے دن کا ہے، اس کے پانچویں دن دوشنبہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں رہے، ان دنوں میں آپ نے وہ تحریر نہیں لکھوائی بلکہ اس کے لکھوانے کا کسی دن ذکر بھی نہیں فرمایا، یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس تحریر کے لکھوانے کا آپ ؐ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں ہوا تھا، بلکہ آپ ؐ کو بطور خود ہی اس کا خیال ہوا تھا اور بعد میں خود آپ کی رائے اس کے لکھانے کی نہیں رہی......اگر اسکے لکھوانے کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہوتا یا آپ کی رائے میں تبدیلی نہ ہوئی ہوتی اور آپ کے نزدیک گمراہی سے امت کی حفاظت کے لئے اس کا لکھانا ضروری ہوتا تو ان پانچ دنوں میں

آپؐ اس کو ضرور لکھواتے اور اس کا نہ لکھوانا (معاذ اللہ) فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی (حاشا، ثم حاشا)........اور یہ بالکل اسی طرح ہوا جس طرح آپؐ نے اسی مرض وفات کے بالکل ابتدا میں حضرت ابوبکر کی خلافت کے بارے میں تحریر لکھوانے کا اور اس کیلئے حضرت ابوبکرؓ اور ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کو بلوانے کا بھی ارادہ فرمایا تھا لیکن بعد میں خود آپ نے اس کو غیر ضروری سمجھ کر اس کے لکھانے کا خیال چھوڑ دیا....اور فرمایا کہ '' یَأبیَ اللہُ والمومِنُوْنَ الا ابابکرً '' تو سمجھنا چاہئے کہ جمعرات کے دن کے اس واقعہ میں بھی ایسا ہوا اور خود حضورؐ نے تحریر لکھانا غیر ضروری سمجھ کر اس کے لکھانے کا ارادہ ترک فرمادیا۔

اس حدیث قرطاس کے بارے میں ایک دوسری قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ جب حضورؐ نے بخار اور شدید تکلیف کی حالت میں تحریر لکھوانے کے لئے لکھنے کا سامان لانے کے لئے فرمایا، تو حضرت عمرؓ نے جو اس وقت حاضر خدمت تھے، حضورؐ سے تو کچھ عرض نہیں کیا، البتہ حاضرین کو مخاطب کر کے ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وقت کی غیر معمولی حالت اور تکلیف کی شدت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ان سے کہا کہ اس وقت حضورؐ کو سخت تکلیف ہے، اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ اس حالت میں ہم لوگوں کو کچھ لکھوانے کی زحمت حضورؐ کو نہیں دینا چاہیے، خود قرآن مجید کے نصوص اور حضورؐ کی تعلیم و تربیت سے یہ یقین ان کے اندر پیدا ہوگیا تھا کہ انسانی دنیا کی ہدایت اور ہر قسم کی گمراہی اور ضلالت سے حفاظت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آئی ہوئی اللہ تعالیٰ کی کتاب ہدایت قرآن مجید کافی ہے، اس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے '' مَا فَرّطْنَا فی الْکِتَابِ مِنْ شَیْ ءٍ '' اور ''تبیاناً لِکُلِّ شی ءٍ '' اور '' تَفْصِیلاً لِّکُلِّ شَیْءٍ '' اور ابھی ''حجّة الوداع '' میں یہ آیت نازل ہو چکی ہے '' الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی '' ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح اعلان فرمادیا ہے کہ انسانی دنیا کی ہدایت کے لئے جو کچھ بتلانا ضروری تھا وہ قرآن میں بیان فرمادیا گیا،

اس سلسلہ کی کوئی ضروری بات بیان کرنے سے نہیں چھوڑی گئی ہے، دین یعنی ضابطۂ حیات و ہدایت بالکل مکمل ہوگیا ہے۔ اس لئے ہم لوگوں کو حضورؐ کو کچھ لکھانے کی زحمت اس تکلیف کی حالت میں نہ دینی چاہئے، قرآن آپ لوگوں کے پاس موجود ہے اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہماری آپ کی ہدایت کے لئے اور ہر قسم کی ضلالت اور گمراہی سے حفاظت کے لئے کافی ہے (**عندکم القراٰن حسبکم کتاب اللہ**)۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اس مجلسی گفتگو کے بعد حضورؐ پانچ دن تک اس دنیا میں رہے، اور وہ تحریر تمہیں لکھوائی، بلکہ اسکے بعد کبھی اس کا ذکر بھی نہیں فرمایا --- آپ کے اس طرز عمل نے حضرت عمرؓ کی اس رائے کی تصویب و تائید فرمادی۔ بلاشبہ یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عظیم فضائل و مناقب میں سے ہے۔ شارحین حدیث نے عام طور سے یہی سمجھا اور یہی لکھا ہے۔

اس حدیث قرطاس کے سلسلہ میں ایک تیسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ حضرت ابن عباس کی اس روایت میں (جو صحیحین کے حوالہ سے یہاں درج کی گئی ہے) اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضورؐ نے لکھنے کا سامان لانے کا حکم کس کو دیا تھا، لیکن اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں مسند احمد کے حوالے سے خود حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے جس میں صراحت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھنے کا سامان لانے حکم انہی کو دیا تھا خود حضرت علی مرتضیٰؓ کا بیان ہے کہ:

امرنی النبی صل اللہ علیہ وسلم ان اٰتیہ بطبقٍ (ای کَتفٍ) یکتب مالا تضلُّ اُمَّتُہٗ بعدہ (فتح الباری جز اول ص ۱۰۶، طبع انصاری دہلی: ۱۳۰۴ھ)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم فرمایا تھا کہ میں طبق (یعنی کتف) لے آؤں تا کہ آپ ایسی تحریر لکھوا دیں جس کے بعد آپ کی امت کبھی گمراہ نہ ہو۔

یہ معلوم ہے کہ حضرت علی مرتضی رضی اللہ عنہ لکھنا جانتے تھے، ان کو لکھنے کا سامان لانے کیلئے حکم

فرمانے کا مطلب بظاہر یہی تھا کہ وہ لکھنے کا سامان لے کر آئیں اور حضورؐ جو لکھوانے چاہتے ہیں وہ اس کو لکھیں۔ .....اور یہ بات بطور واقعہ معلوم اور مسلم ہے کہ حضرت علی مرتضی نے بھی وہ تحریر نہیں لکھی..... یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرح انھوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ حضورؐ اس شدید تکلیف کی حالت میں کچھ لکھوانے کی زحمت نہ فرمائیں اور غالبًا انکی رائے بھی یہی ہوئی کہ امت کی ہدایت اور ہر قسم کی ضلالت سے حفاظت کیلئے کتاب اللہ کافی ہے۔

اس حدیث میں ایک اور وضاحت طلب بات یہ ہے کہ سعید بن جبیر کی مندرجہ بالا روایت کے مطابق جب حضورؐ نے لکھنے کا سامان لانے کا حکم فرمایا تو بعض لوگوں نے کہا ''ماشانه؟ اَهَجر؟ ''اس کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے یہ صورتِ حال پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ جب بیماری کی شدت اور سخت تکلیف کی حالت میں بطور وصیت ایسی تحریر لکھوانے کا ارادہ ظاہر فرمایا جس کے بعد آپ کی امت کبھی گمراہ نہ ہو تو بعض حضرات کو محسوس ہوا کہ شاید سفرِ آخرت کا وقت آ گیا ہے، اس وجہ سے بطور وصیت ایسی تحریر لکھوانے کا حکم فرما رہے ہیں، یہ لوگ اس احساس سے سخت مضطرب اور بیچین ہو گئے اور انھوں نے اس اضطراب کی حالت میں کہا '' ما شانه؟ اهجر؟ استفهموه'' (حضورؐ کا کیا حال ہے، کیا آپؐ جدائی اختیار فرما رہے ہیں، ہم کو چھوڑ کے جا رہے ہیں؟ آپؐ سے دریافت کیا جائے) اس میں هَجَرَ هِجر سے مشتق ہے جس کے معنی جدائی اختیار کرنے اور چھوڑ کے جانے کے ہیں۔ یہ لفظ اسی معنی میں اردو میں بھی مستعمل ہے ''وصل'' کے مقابلہ میں '' ہجر'' بولا جاتا ہے اور ہجرت کے معنی ترک وطن کے ہیں۔ بعض حضرات نے اس کو 'هُجر' سے مشتق سمجھا ہے، جس کے معنی ہیں بیمار آدمی کا بیہوشی کی حالت میں بہکی بہکی باتیں کرنا جس کو ہذیان کہا جاتا ہے، اس صورت میں حدیث کے اس جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ حضورؐ کچھ لکھوانے کے لئے جو فرما رہے ہیں کیا یہ ہذیان ہے؟ آپ سے دریافت کرو۔ ظاہر ہے کہ یہ مطلب کسی طرح درست نہیں ہوسکتا، کیونکہ جو مریض بیہوشی کی حالت میں بہکی بہکی باتیں کرتا ہو وہ

ایسے حال میں نہیں ہوتا کہ اس سے کچھ دریافت کیا جائے، الغرض ''استفھمو ہ'' کا لفظ اس کا مطلب ہے کہ ہجر کا لفظ ہُجر سے مشتق نہیں ہے جس کے معنی ہذیان کے ہیں۔

اس کے علاوہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ '' لکھنے کا سامان لے آؤ میں ایک تحریر لکھوادوں جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہوگے،'' یہ ہرگز ایسی بات نہیں تھی جس کے بارے میں کسی کو ہذیان کا شبہ بھی ہو، اگر چہ 'أھجر' کو استفہام انکاری قرار دیکر یہ معنی بھی بن سکتے ہیں، لیکن واقعہ یہی ہے کہ یہاں اس لفظ کا ہذیان کے معنی میں ہونا بہت مستبعد ہے۔

حدیث کے اس جملہ 'اھجر استفھمو ہ'' کے بارے میں یہ بات بھی خاص طور سے قابلِ لحاظ ہے کہ اس کے کہنے والے حضرت عمرؓ نہیں ہیں یہ بات کچھ دوسرے حضرات نے کہی تھی جن کے نام بھی حدیث میں مذکور نہیں ہیں، بلکہ ''فــقــالــوا'' کا لفظ ہے (یعنی کچھ لوگوں نے کہا)، شیعہ مصنفین حضرت عمرؓ کو لعن طعن کا نشانہ بنانے کے لئے یہ جملہ زبردستی ان کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ انھوں نے حضورؐ کے اس ارشاد کو ہذیان کہا (معاذ اللہ) حالانکہ اہلِ سنت کی حدیث کی کسی معتبر کتاب میں کوئی روایت نہیں ہے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ یہ بات حضرت عمرؓ نے فرمائی تھی......انھوں نے اس موقع پر وہی فرمایا تھا جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مندرجہ پہلی روایت میں ذکر کیا گیا ہے (عــنــد کــم القراٰن حسبکم کتاب الله) ہاں '' اھجر استفھمو ہ'' بھی بعض صحابہ کرام ہی نے کہا تھا لیکن اس کا مطلب وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا اور وہ بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انکے عشق ومحبت کی دلیل ہے۔

(ماخوذ از: معارف الحدیث، جلد ہشتم، ص:۲۵۲ تا ۲۶۱)

پہلا خلیفہ کون؟

اللہ، رسول اللہ اور مومنین کی منشا کیا تھی؟

[صحیح مسلم کی ایک روایت جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اللہ، رسول اللہ اور مومنین (صحابہ) کے نزدیک اولین خلیفہ ہونے کا حق دار کون تھا، اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعۂ قرطاس میں اگر آپؐ خلافت کے بارے میں وصیت فرماتے تو کس کے بارے میں فرماتے]

عن عائشة قالت: قال لی رسول الله صلی الله علیه وسلم فی مرضه: ادعی لی أبابکر أباک، وأخاک حتیٰ أکتب کتابا، فانی أخاف أن یتمنی متمن ویقول قائل: أنا أولیٰ، ویابیٰ اللّٰه والمؤمنون اِلاّ أبابکر ''۔(صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ رضی اللہ عنہم، باب من فضائل أبی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ، حدیث نمبر : ۲۳۸۷)۔

'' حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض وفات میں فرمایا: اپنے والد ابوبکرؓ اور اپنے بھائی کو بلاؤ، تا کہ میں ایک تحریر لکھوا دوں، اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی تمنا کرنے والا تمنا کرنے لگے، اور کوئی شخص کہنے لگے کہ میں (خلافت کا) زیادہ مستحق ہوں، حالانکہ اللہ اور مومنین کو ابوبکرؓ کے علاوہ کوئی اور منظور نہیں۔

سقیفۂ بنی ساعدہ
اور حضرت ابوبکرؓ کی خلافت

علامہ شبلی نعمانی

یہ واقعہ بظاہر تعجب سے خالی نہیں کہ جب آنحضرتؐ نے انتقال فرمایا تو فوراً خلافت کی نزاع پیدا ہوگئی، اور اس بات کا بھی انتظار نہ کیا گیا کہ پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین سے فراغت حاصل کرلی جائے، کس کے قیاس میں آسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما ہیں، اور جن لوگوں کو ان کے عشق و محبت کا دعویٰ ہو وہ ان کو بے گور و کفن چھوڑ کر چلے جائیں، اور اس بندوبست میں مصروف ہوں کہ مسندِ حکومت اوروں کے قبضہ میں نہ آجائے۔

تعجب پر تعجب یہ ہے کہ یہ فعل اُن لوگوں سے (حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ) سرزد ہوا، جو آسمانِ اسلام کے مہر و ماہ تسلیم کئے جاتے ہیں، اس فعل کی ناگواری اس وقت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو آنحضرتؐ سے فطری تعلق تھا، یعنی حضرت علیؓ و خاندان بنی ہاشم اُن پر فطری تعلق کا پورا اثر ہوا، اور اس وجہ سے اُن کو آنحضرتؐ کے درد و غم اور تجہیز و تکفین سے اِن باتوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ ملی۔

ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ کتب حدیث و سیر سے بظاہر اسی قسم کا خیال پیدا ہوتا ہے، لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے، یہ سچ ہے کہ حضرت عمرؓ (و ابوبکرؓ وغیرہ) آنحضرت کی تجہیز و تکفین چھوڑ کر سقیفۂ بنی ساعدہ کو چلے گئے، اور یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے سقیفہ میں پہنچ کر خلافت کے باب میں انصار سے معرکہ آرائی کی اور اس طرح ان کوششوں میں مصروف رہے کہ گویا اُن پر کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا تھا، یہ بھی

سچ ہے کہ انھوں نے اپنی خلافت کو نہ صرف انصار بلکہ بنو ہاشم اور حضرت علیؓ سے بھی بزور منوانا چاہا، گو بنو ہاشم نے آسانی سے اُن کی خلافت تسلیم نہیں کی، لیکن اس بحث میں غور طلب جو باتیں ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کیا خلافت کا سوال حضرت عمرؓ وغیرہ نے چھیڑا تھا۔

۲۔ کیا یہ لوگ خود اپنی خواہش سے سقیفۂ بنی ساعدہ میں گئے تھے۔

۳۔ کیا حضرت علیؓ اور بنو ہاشم خلافت کی فکر سے بالکل فارغ تھے۔

۴۔ ایسی حالت میں جو کچھ حضرت عمرؓ وغیرہ نے کیا وہ کرنا چاہئے تھا، یا نہیں؟

دو پہلی بحثوں کی نسبت ہم نہایت مستند کتاب مسند ابولعلی کی عبارت[۱] نقل کرتے ہیں جس سے واقعہ کی کیفیت بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے:

بینما نحن فی منزل رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا رجل ینادی من وراء الجدار ان اخرج الیّ یا ابن الخطاب فقلت الیك عنی فانا عنك مشاغیل یعنی بامر رسول الله صلی الله علیه وسلم فقال لهٗ قد حدث امرفان الانصار اجتمعوا فی سقیفة بنی ساعدة فادرکوھُم ان یحدثوا امراً یکون فیه حرب فقلت لابی بکر انطلق۔

"حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم رسول اللہؐ کے خانۂ مبارک میں بیٹھے تھے کہ دفعۃً دیوار کے پیچھے سے ایک آدمی نے آواز دی کہ ابن الخطاب! (حضرت عمرؓ) ذرا باہر آؤ! میں نے کہا کہ چلو ہٹو، ہم لوگ آنحضرتؐ کے بندوبست میں مشغول ہیں، اُس نے کہا کہ ایک حادثہ پیش آیا ہے، یعنی انصار سقیفۂ بنی ساعدہ میں اکٹھے ہوئے ہیں، اس لئے جلد پہنچ کر اُن کی خبر لو، ایسا نہ ہو کہ انصار کچھ ایسی بات کر بیٹھیں جس سے لڑائی چھڑ جائے، اُس وقت میں نے ابوکر سے کہا کہ چلو"۔

---

[۱] دیکھو فتح الباری: ۲۳/۷

اس سے ظاہر ہوگا کہ نہ حضرت عمرؓ وغیرہ نے خلافت کی بحث کو چھیڑا تھا نہ وہ اپنی خوشی سے سقیفۂ بنی ساعدہ کو جانا چاہتے تھے۔

تیسری بحث کی یہ کیفیت ہے کہ اُس وقت جماعت اسلامی تین گروہوں میں تقسیم کی جاسکتی تھی، (۱) بنو ہاشم جس میں حضرت علیؓ شامل تھے، (۲) مہاجرین، جن کے رئیس و افسر حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ تھے، (۳) انصار جن کے شیخ القبیلہ عبادہؓ تھے۔ ان تینوں میں سے ایک گروہ بھی خلافت کے خیال سے خالی نہ تھا، انصار نے تو علانیہ اپنا ارادہ ظاہر کردیا تھا، بنو ہاشم کے خیالات ذیل کی روایت سے معلوم ہوں گے:

آنحضرتؐ کی وفات کے دن حضرت علیؓ مکان سے باہر نکلے، لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ رسول اللہؐ کا مزاج کیسا ہے، چونکہ آنحضرتؐ کی ظاہری حالت سنبھل گئی تھی، حضرت علیؓ نے کہا خدا کے فضل سے آپ اچھے ہوگئے، حضرت عباسؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ خدا کی قسم تم تین دن کے بعد غلامی کروگے، میں آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ رسول اللہ عنقریب اس مرض میں وفات پائیں گے، کیونکہ مجھکو اس کا تجربہ ہے کہ خاندان عبدالمطلب کا چہرہ موت کے قریب کس طرح متغیر ہوجاتا ہے، آؤ چلو! رسول اللہ سے پوچھ لیں کہ آپ کے بعد یہ منصب (خلافت) کس کو حاصل ہوگا، اگر ہم اس کے مستحق ہیں تو رسول اللہ ہمارے لئے وصیت فرمادیں گے، حضرت علیؓ نے کہا ''میں نہ پوچھونگا، کیونکہ اگر پوچھنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار کردیا تو پھر آئندہ کوئی امید نہیں رہے گی[۱]۔''

اس روایت سے حضرت عباسؓ کا خیال تو صاف معلوم ہوتا ہے، حضرت علیؓ کو آنحضرتؐ کی وفات کا اُس وقت تک یقین نہ تھا، اس لئے انھوں نے کوئی تحریک کرنا مناسب نہیں سمجھا، اس کے علاوہ اُن کو اپنے انتخاب کئے جانے پر بھروسہ نہ تھا۔

---

[۱] صحیح بخاری، باب مرض النبی مع فتح الباری

آنحضرتؐ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ کے گھر میں ایک مجمع ہوا جس میں تمام بنو ہاشم، اور اُن کے اتباع شریک تھے، اور حضرت علیؓ اُن کے پیشرو تھے، صحیح بخاری[1] میں حضرت عمرؓ کی زبانی روایت ہے:

کان من خبر نا حین توفی اللہ نبیّہٗ انّ الانصار خالفونا و اجتمعوا باسرھم فی سقیفۃ بنی ساعدۃ و خالف عنا علی و الزبیر و من معھما واجتمع المھاجرون الی ابی بکر"۔

یہ تقریر حضرت عمرؓ نے ایک بہت بڑے مجمع عام میں کی تھی، جس میں سیکڑوں صحابہ موجود تھے، اس لئے اس بات کا گمان نہیں ہوسکتا کہ انھوں نے کوئی امر خلاف واقعہ کہا ہو، ورنہ لوگ اُن کو وہیں ٹوکتے، امام مالک کی روایت میں یہ واقعہ اور صاف ہوگیا ہے، اس کے یہ الفاظ ہیں[2]:

وان علیا والزبیرومن کان معھما تخلفوا فی بیت فاطمۃ بنت رسو ل اللّٰہ

اور علی و زبیر اور جو لوگ اُن کے ساتھ تھے، وہ حضرت فاطمہ زہراؓ کے گھر میں ہم سے الگ ہوکر جمع ہوئے۔

تاریخ طبری میں ہے[3]:

" وتخلّف علی والزبیر واخترط الزبیر سیفه وقال لا أغمدهٗ حتی یبایَع عَلیّ"

اور حضرت علی و زبیر نے علیحدگی اختیار کی، اور زبیر نے تلوار میان سے کھینچ لی، اور کہا کہ جب تک علی کے ہاتھ پر بیعت نہ کی جائے، میں تلوار کو میان میں نہ ڈالوں گا۔

ان تمام روایتوں سے صاف یہ نتائج نکلتے ہیں کہ:

۱۔ آنحضرتؐ کی وفات کے ساتھ ہی خلافت کے باب میں تین گروہ تھے، انصار، مہاجرین،

---

[1] بخاری، کتاب الحدود، باب رجم الحبلیٰ

[2] فتح الباری، شرح حدیث مذکور

[3] تاریخ طبری: ۱۸۲۰

بنو ہاشم۔

۲۔ مہاجرین حضرت ابوبکرؓ کے اور بنو ہاشم حضرت علیؓ کے ساتھ تھے۔

۳۔ جس طرح حضرت عمرؓ وغیرہ آنخضرتؐ کو چھوڑ کر سقیفہ کو چلے گئے تھے، حضرت علیؓ بھی آنخضرت کے پاس سے چلے آئے تھے، اور حضرت فاطمہؓ کے گھر میں بنو ہاشم کا مجمع ہوا تھا۔

سقیفہ میں حضرت علیؓ کا نہ جانا اس وجہ سے نہ تھا کہ وہ آنخضرتؐ کے غم والم میں مصروف تھے، اور اُن کو ایسے پُر درد موقع پر خلافت کا خیال نہیں آسکا تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ سقیفہ میں مہاجرین وانصار جمع تھے، اور ان دونوں گروہ میں سے کوئی حضرت علیؓ کے دعوے کی تائید نہ کرتا، کیونکہ مہاجرین حضرت ابوبکر کو پیشوا تسلیم کرتے تھے، اور انصار کے رئیس سعد بن عبادہؓ تھے۔

اخیر بحث یہ ہے کہ جو کچھ ہوا وہ بیجا تھا، یا بجا؟ اس کو ہر شخص جو ذرا بھی اصولِ تمدن سے واقفیت رکھتا ہو بآسانی سمجھ سکتا ہے، آنخضرتؐ نے جس وقت وفات فرمائی مدینہ منورہ منافقوں سے بھرا ہوا پڑا تھا، جو مدت سے اس بات کے منتظر تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سایہ اٹھ جائے تو اسلام کو پامال کر دیں، اس نازک وقت میں آیا یہ ضروری تھا کہ لوگ جزع وفزع اور گریہ وزاری میں مصروف رہیں یا یہ کہ فوراً خلافت کا انتظام کرلیا جائے، اور ایک منظّم حالت قائم ہوجائے، انصار نے اپنی طرف سے خلافت کی بحث چھیڑ کر حالت کو اور نازک کردیا، کیونکہ قریش...... کسی طرح انصار کے آگے سر تسلیم خم نہیں کرسکتے تھے، قریش پر کیا موقوف ہے، تمام عرب کو انصار کی متابعت سے انکار ہوتا، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے سقیفہ میں جو خطبہ دیا، اُس میں صاف اس خیال کو ظاہر کیا، اور کہا وانّ العرب لا تعرف هذا الامر الالهذا الحی من قریش اس کے علاوہ انصار میں خود دو گروہ تھے، اوس وخزرج، اور ان میں باہم اتفاق نہ تھا، اس حالت میں ضروری تھا کہ انصار کے دعوئ خلافت کو دبا دیا جائے، اور کوئی لائق شخص فوراً انتخاب کرلیا جائے، مجمع میں جو لوگ موجود تھے، اُن میں سب سے بااثر اور بزرگ اور معمر حضرت

ابوبکرؓ تھے، اور فوراً اُن کا انتخاب ہو بھی جاتا، لیکن لوگ انصار کی بحث ونزاع میں پھنس گئے تھے، اور بحث طول پکڑ کر قریب تھا کہ تلواریں میان سے نکل آئیں، حضرت عمرؓ نے یہ رنگ دیکھ کر دفعۃً حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیا کہ سب سے پہلے میں بیعت کرتا ہوں، ساتھ ہی حضرت عثمانؓ، ابوعبیدہ بن جرّاح، عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے بھی ہاتھ بڑھائے، اور پھر عام خلقت ٹوٹ پڑی، اس کارروائی سے ایک اٹھتا ہوا طوفان رُک گیا اور لوگ مطمئن ہو کر کاروبار میں مشغول ہو گئے، صرف بنو ہاشم اپنے ادعا پر رکے رہے اور حضرت فاطمہؓ کے کے گھر میں وقتاً فوقتاً جمع ہو کر مشورے کرتے رہتے تھے۔

(ماخوذ از: الفاروق، ص: ۵۹ تا ۶۵، مطبوعہ دارالمصنفین)

خلفاء کی ترتیب
اور اہل بیت کے ساتھ خدا کا معاملہ عظیم حکمتوں پر مبنی تھا

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

ہمارے نزدیک نہ یہ اتفاقی واقعہ تھا نہ کسی سازش اور منصوبہ بندی کا نتیجہ کہ آپ (ﷺ) کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد مسند خلافت پر آپ کے خاندان کے کسی فرد کے بجائے (جو بلا شبہ اعلیٰ انسانی اوصاف وکمالات کا حامل تھا) قریش کی ایک دوسری شاخ (بنوتیم) کا ایک فرد (ابوبکر صدیقؓ) مسلمانوں کے عام انتخاب وپسندیدگی کے مطابق متمکن ہوا، جو بنو ہاشم اور بنی عبدالمطلب میں سے نہ تھا، تاکہ پہلے ہی مرحلہ میں یہ بات ذہنوں میں راسخ اور عالم آشکار ہوجائے کہ اسلام کوئی وراثتی نظام اور خاندانی مسئلہ نہیں ہے، اس میں خلافت وامامت کا انحصار قابلیت، خدمات اور مسلمانوں کی عام پسندیدگی اور فیصلہ پر ہے۔

پھر راقم سطور کے نزدیک یہ بھی محض کسی اتفاق یا مجبوری کی بات نہیں تھی کہ اس کے بعد بھی صدیوں تک بنی ہاشم کے ساتھ خدا اور امت کا یہی معاملہ رہا کہ وہ محض اپنے علم وفضل، زہد وتقویٰ، ایثار وقربانی، حمیّت اور اولوالعزمی کے ذریعہ امت محمدیہؐ کے اعزاز واکرام کے مستحق اور علمی و دینی امامت وقیادت پر فائز ہوتے رہے، اور امت ان کی خدمت میں اپنی عقیدت ومحبت کا خراج پیش کرتی رہی۔

(ماخوذ از: دین اسلام اور اولین مسلمانوں کے بارے میں دو متضاد تصویریں، ص: ۷۴، ۷۵)

حضرت معاویہؓ: ایک مظلوم شخصیت

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ: مرتب

حضرت معاویہؓ بلکہ پورے بنوامیہ پر دو گروہوں نے ظلم کیا ہے:

پہلا گروہ: ''اخبار بین''یعنی وہ راویانِ تاریخ جنہوں نے اپنے جذبات اور اپنی خواہشات کے زیر اثر واقعات و روایات میں تحریفیں کیں، اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ عہد بنوامیہ کی تاریخ اس کے خاتمہ کے بعد اور ان کے حریف بنوعباس کے عہد حکومت میں لکھی گئی ہے۔

بنوامیہ پر ظلم کرنے والا دوسرا گروہ ان نئے اصحاب قلم پر مشتمل ہے جو بنی امیہ سے نہایت ناراض ہیں، اس کتاب میں ہم بعض ممتاز داعیوں کے ایسے اقتباسات نقل کر آئے ہیں جن میں انہوں نے پوری اسلامی تاریخ بالخصوص عہد بنی امیہ کے سلسلے میں نہایت نارو اور بے جا رویہ اختیار کیا ہے، جذباتی حکم لگائے ہیں، اور اخبار و روایات کی تحقیق و تنقید کی زحمت نہیں اٹھائی ہے''۔

(ماخوذ از: تاریخنا المفتریٰ علیہ، ص: ۷۹، ۸۰)

حضرت علیؓ پر سبّ وشتم

مولانا محمد تقی عثمانی

مولانا مودودی صاحب نے ''قانون کی بالاتری کا خاتمہ'' کے عنوان کے تحت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر چوتھا اعتراض یہ کیا ہے کہ:

ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھار کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضۂ نبوی کے سامنے حضورؐ کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں، اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے۔ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف ہے اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آ کر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبۂ جمعہ میں سبِّ علی کی جگہ یہ آیت پڑھنی شروع کر دی۔ **ان اللّٰہ یأمر بالعدل والاحسان.....الخ**۔ (ص:۱۷۴)

مولانا نے اس عبارت میں تین دعوے کئے ہیں: ایک یہ کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ پر خود سب وشتم کی بوچھار کرتے تھے، دوسرے یہ کہ ان کے تمام گورنر یہ حرکت کرتے تھے، تیسرے یہ کہ یہ گورنر حضرت معاویہؓ کے حکم سے ایسا کرتے تھے۔ اب تینوں دعووں کا اصل مآخذ میں مطالعہ کیجئے۔

جہاں تک پہلے دعوے کا تعلق ہے، سو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف اس ''مکروہ بدعت'' کو منسوب کرنے کے لئے انہوں نے تین کتابوں کے پانچ حوالے پیش کئے ہیں (طبری ج ۴ ص: ۱۸۸، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۳۴، ج ۴ ص ۴۵۴، البدایہ، ج ۹ ص ۸۰) ہم نے ان میں سے ایک ایک حوالے کو صرف مذکورہ صفحات ہی پر نہیں بلکہ ان کے آس پاس بھی بنظر غائر دیکھا، ہمیں کسی بھی کتاب میں یہ کہیں نہیں ملا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ''خود'' حضرت علی رضی اللہ عنہ پر برسر منبر سبّ وشتم کی بوچھار کرتے تھے، لیکن چونکہ مولانا نے تصریح کے ساتھ لکھا ہے کہ اس ''انسانی اخلاق کے خلاف'' فعل کا ارتکاب وہ ''خود'' کیا کرتے تھے، اس لئے ہم نے سوچا کہ شاید مولانا نے ایسی کوئی روایت کسی اور مقام پر دیکھ لی ہو اور اس کا حوالہ دینا بھول گئے ہوں، چنانچہ ہم نے مذکورہ تمام کتابوں کے متوقع مقامات پر دیر تک جستجو کی کہ شاید کوئی گری پڑی روایت ایسی مل جائے، لیکن یقین فرمائیے کہ ایسی کوئی بات ہمیں کسی کتاب میں نہیں ملی، پھر بعض ان تواریخ کی طرف بھی رجوع کیا جن کے بارے مس مولانا کو اعتراف ہے کہ ان کے مصنف شیعہ تھے، مثلاً مسعودی کی مروج الذہب، لیکن اس میں بھی ایسی کوئی بات نہیں ملی۔

اس کے برعکس اس جستجو کے دوران ایسی متعدد روایات ہمیں ملیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت معاویہؓ حضرت علیؓ سے اختلاف کے باوجود ان کا کس قدر احترام کرتے تھے؟ ان میں سے چند روایات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ حافظ ابنِ کثیر فرماتے ہیں۔

لما جاء خبر قتل علي الی معاوية جعل يبكی ، فقالت له امرأته ، أتبكيه وقد قاتلته ؟ فقال ويحک انک لا تدرين ما فقد الناس من الفضل والفقه والعلم.

(البداية والنهاية: ۸/ ۱۳۰)

ترجمہ: جب حضرت معاویہؓ کو حضرت علیؓ کے قتل ہونے کی خبر ملی تو وہ رونے لگے،

ان کی اہلیہ نے ان سے کہا کہ آپ اب ان کو روتے ہیں حالانکہ زندگی میں ان سے لڑ چکے ہیں؟ حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ تمہیں پتہ نہیں کہ آج لوگ کتنے علم وفضل اور فقہ سے محروم ہو گئے۔

یہاں حضرت معاویہؓ کی اہلیہ محترمہ نے یہ اعتراض تو کیا کہ ''اب آپ انہیں کیوں روتے ہیں جبکہ زندگی میں ان سے لڑتے رہے؟'' لیکن یہ نہیں کہا کہ ''زندگی میں تو آپ ان پر سبّ وشتم کیا کرتے تھے، اب ان پر کیوں روتے ہیں؟''۔

۲۔امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت بسر بن ارطاۃؓ نے حضرت معاویہؓ اور حضرت زید بن عمر بن خطابؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کو کچھ برا بھلا کہا، حضرت معاویہؓ نے اس پر انہیں توبیخ کرتے ہوئے فرمایا:

تشتم علیّاً وھو جدہ. (طبری: ۲۴۸/۴ مطبعۃ الاستقامۃ، قاھرہ، ۱۳۵۸ھ)

ترجمہ تم علیؓ کو گالی دیتے ہو حالانکہ وہ ان کے دادا ہیں۔

۳۔علامہ ابن اثیر جزریؒ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا جو آخری خطبہ نقل کیا ہے، اس میں ان کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ:

لن یأتیکم من بعدی الا من أنا خیر منہ کما أن من قبلی کان خیراً منّی.

(الکامل، ابن اثیر، ۲/۴)

ترجمہ: میرے بعد تمہارے پاس (جو خلیفہ) بھی آئے گا میں اس سے بہتر ہوں گا، جس طرح مجھ سے پہلے جتنے (خلفاء) تھے مجھ سے بہتر تھے۔

۴۔علامہ ابن عبدالبر نے نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بڑے اصرار کے ساتھ ضرار صدائی سے کہا کہ ''میرے سامنے علی کے اوصاف بیان کرو''، ضرار صدائی نے بڑے بلیغ

الفاظ میں حضرت علیؓ کی غیر معمولی تعریفیں کیں، حضرت معاویہؓ سنتے رہے اور آخر میں رو پڑے، پھر فرمایا:

رحم اللہ أباالحسن ، کان واللہ کذالک. (الاسیعاب تحت الاصابة، ۳/ ۴۳، ۴۴، المکتبة التجاریة الکبری، قاھرہ).

ترجمہ: اللہ ابوالحسن (علیؓ) پر رحم کرے، خدا کی قسم وہ ایسے ہی تھے۔

نیز حافظ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مختلف فقہی مسائل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے خط وکتابت کے ذریعے معلومات حاصل کیا کرتے تھے، چنانچہ جب ان کی وفات کی خبر پہنچی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

ذھب الفقه والعلم بموت ابن أبی طالب. (الاستیعاب تحت الاصابة، ۳/ ۴۵)

ترجمہ: ابن ابی طالب کی موت سے فقہ اور علم رخصت ہوگئے۔

غرض اس جستجو کے دوران ہمیں اس قسم کی تو کئی روایتیں ملیں، لیکن کوئی ایک روایت بھی ایسی نہ مل سکی جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (معاذ اللہ) خطبوں میں حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھار کیا کرتے تھے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر یہ الزام کس بنیاد پر؟ کس دل سے عائد کیا ہے؟

پھر دوسرا دعویٰ مولانا نے یہ کیا ہے کہ ''ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسر منبر حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھار کرتے تھے''۔

ظاہر ہے کہ مولانا کا یہ دعویٰ اس وقت تو ثابت ہوسکتا ہے جب وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ''تمام گورنروں'' کی ایک فہرست جمع فرما کر ہر ایک گورنر کے بارے میں یہ ثابت فرمائیں کہ ان میں سے ہر ایک نے انفرادی یا اجتماعی طور پر (نعوذ باللہ) حضرت علی رضی اللہ عنہ کو گالیاں دی تھیں، نیز اس بات کا بھی ثبوت ان کے پاس ہو کہ ان میں سے ہر ایک کو انفرادی یا اجتماعی طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ

عنہ نے یہ حکم دیا تھا کہ حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کی بوچھار کیا کرو۔

لیکن اپنے اس الزام کی تائید میں جو حوالے مولانا نے پیش کئے ہیں ہم نے ان کی طرف رجوع کیا تو ان میں سے ایک بات بھی صحیح ثابت نہیں ہوسکی۔ اول تو سمجھ لیجئے کہ مولانا کے دیے ہوئے پانچ حوالوں میں حضرت معاویہؓ کے صرف دو گورنروں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ حضرت علی کی مذمت کیا کرتے تھے، ایک حضرت مغیرہ بن شعبہؓ دوسرے مروان بن الحکم[1]۔ اگر ان روایات کو تھوڑی دیر کے لئے درست مان لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دو گورنروں پر یہ الزام لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہا کرتے تھے۔ اس سے آخر یہ کیسے لازم آ گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ''تمام گورنر'' خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے حکم سے ایسا کیا کرتے تھے۔ یہ ''تمام گورنر'' کا الزام تو ایسا ہے کہ اسے شاید کسی موضوع روایتوں کے مجموعے سے بھی ثابت نہ کیا جا سکے۔

اس کے بعد اب ان دو روایتوں کی حقیقت بھی سن لیجئے جن میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ اور مروان بن الحکم کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ (معاذ اللہ) حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کیا کرتے تھے۔

پہلی روایت اصلاً علامہ ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ ذکر کی ہے اور انہیں سے نقل کر کے ابن اثیر جزریؒ نے اپنی تاریخ الکامل میں اسے درج کر دیا ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قال هشام بن محمد عن أبی مخنف عن المجاهد بن سعيد والصقعب بن زهير و فضيل بن خديج والحسين بن عقبة المرادی قال: كل قد حدثنی بعض هذا الحديث فاجتمع حديثهم فيما سقت

---

[1] طبری: ۱۸۸/۴، کامل ابن اثیر، ۲۳۴/۳ کا حوالہ مولانا نے حضرت مغیرہ بن شعبہ سے متعلق دیا ہے، اور البدایۃ: ۲۵۹/۸ کا حوالہ مروان بن الحکم سے متعلق ہے، رہ گیا البدایۃ ۸۰/۹ کا حوالہ سو اس میں حجاج بن یوسف کے بھائی محمد بن یوسف الثقفی کا ذکر ہے جو حضرت معاویہ کا نہیں بلکہ ان کے بہت بعد ولید بن عبدالملک کا گورنر تھا، اسی طرح ابن اثیر: ۱۵۴/۴ میں بنوامیہ کے خلفا کا عمومی تذکرہ ہے، حضرت معاویہ یا ان کے کسی گورنر کا نہیں۔

من حديث حجر بن عدى الكندى وأصحابه أن معاوية بن أبى سفيان لما ولى المغيرة بن شعبة فى جمادى الثانية سنة ۴۱ دعاه فحمدالله وأثنى عليه ثم قال: أما بعد .... وقد أردت ايصاء ک بأشياء كثيرة فأناتاركها اعتماداً على بصرک بما يرضينى ويسعد سلطانى ويصلح به رعيتى ولست تاركاً ايصاء ک بخصلة لا تتحم عن شتم على وذمه والترحم على عثمان والاستغفار له والعيب على أصحاب على والاقصاء لهم وترک الاستماع منهم .... قال أبو مخنف : قال الصقعب بن زهير : سمعت الشعبى يقول......وأقام المغيرة على الكوفة عاملا لمعاوية سبع سنين و أشهراً وهو من أحسن شى ء سيرة وأشدحبا للعافية غير أنه لا يدع ذم على والوقوع فيه. (طبرى: ۱۸۷/۴، ۱۸۸).

ترجمہ: ہشام بن محمد نے ابومخنف سے اورانہوں نے مجاہد بن سعید، صقعب بن زبیر، فضیل بن خدیج اور حسین بن عقبہ مرادی سے روایت کیا ہے کہ ابومخنف کہتے ہیں کہ ان چاروں نے مجھے آئندہ واقعے کے تھوڑے تھوڑے ٹکڑے سنائے، لہذا حجر بن عدی کندی کا جو واقعہ میں آگے سنا رہا ہوں اس میں ان چاروں کی مختلف روایتیں جمع ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب ماہ جمادی الثانیہ ۴۱ھ میں معاویہ بن ابی سفیانؓ نے کوفہ پر مغیرہ بن شعبہؓ کو گورنر بنایا تو انہیں بلا کر پہلے اللہ کی حمد وثنا کی پھر کہا کہ..........میرا ارادہ تھا کہ میں تمہیں بہت چیزوں کی نصیحت کروں، لیکن چونکہ مجھے اعتماد ہے کہ تم مجھے راضی رکھنے، میری سلطنت کو کامیاب بنانے اور میری رعایا کی اصلاح کرنے پر پوری نظر

رکھتے ہو، اس لئے میں ان تمام باتوں کو چھوڑتا ہوں ۔ البتہ تمہیں ایک نصیحت کرنا میں ترک نہیں کرسکتا وہ یہ کہ علیؓ کی مذمت کرنے اورانہیں گالی دینے سے پرہیز نہ کرنا، عثمانؓ پر رحمت بھیجتے رہنا اوران کے لئے استغفار کرتے رہنا، علیؓ کے اصحاب پرعیب لگانا، انہیں دور رکھنا اوران کی بات نہ سننا، عثمانؓ کے اصحاب کی خوب تعریف کرنا، انہیں قریب کرنا اوران کی باتیں سنا کرنا........ابومخنف کہتا ہے کہ صقعب بن زبیر نے کہا کہ میں نے شعبی کو کہتے ہوئے سنا کہ مغیرہؓ کوفہ میں معاویہؓ کے عامل کی حیثیت سے سات سال اور کچھ مہینے رہے، وہ بہترین سیرت کے مالک تھے اور عافیت کو تمام لوگوں سے زیادہ پسند کرتے تھے، البتہ وہ علیؓ کی مذمت اورانہیں بُرا بھلا کہنا نہیں چھوڑتے تھے۔

یہ ہے وہ روایت جو مولانا کے مذکورہ بیان کی اصل الاصول ہے، اور جسے دیکھ کر مولانا نے صرف حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر نہیں بلکہ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اوران کے تمام گورنروں پر بلا استثناء الزام لگادیا ہے کہ وہ برسرِ منبر حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کیا کرتے تھے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگراس روایت کو درست مان لیا جائے تو خود اسی روایت میں آگے چل کر صاف لکھا ہوا ہے کہ وہ حضرت علیؓ کی مذمت کس طرح کیا کرتے تھے؟ ٹھیک اسی صفحے پر جس پر ابو مخنف کے مذکورہ بالا الفاظ لکھے ہیں، آگے یہ الفاظ بھی ہیں کہ:

قام المغيرة فقال فی علی و عثمان کما کان یقول و کانت مقالته: اللّٰهم ارحم عثمان بن عثمان وتجاوزعنه وأجزه بأحسن عمله فانه عمل بكتابک واتبع سنة نبیک صلی الله علیه وسلم وجمع کلمتنا وحقن دماء نا وقتل مظلوماً اللّٰهم فارحم أنصاره وأولیا ء ومحبه والطالبین بدمه ویدعوعلی قتلته .(طبری: ۱۸۸/۴)

ترجمہ: حضرت مغیرہؓ کھڑے ہوئے اور حضرت علیؓ اور عثمانؓ کے بارے میں جو کچھ کہا کرتے تھے وہی کہا۔ ان کے الفاظ یہ تھے کہ یا اللہ! عثمانؓ بن عفان پر رحم فرما اور ان سے درگزر فرما اور ان کے بہتر عمل کی انہیں جزا دے، کیونکہ انہوں نے تیری کتاب پر عمل کیا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی اور ہماری بات ایک کردی، اور ہمارے خون کو بچایا اور مظلوم ہو کر قتل ہوگئے، یا اللہ ان کے مددگاروں، دوستوں، محبت کرنے والوں اور ان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والوں پر رحم فرما۔ اور وہ ان کے قاتلوں کے لئے بددعا کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ درحقیقت حضرت مغیرہؓ حضرت علیؓ کی ذات پر کوئی شتم نہیں فرماتے تھے بلکہ وہ قاتلین عثمانؓ کے لئے بددعا کیا کرتے تھے، جسے شیعہ راویوں نے حضرت علیؓ پر لعن طعن سے تعبیر کردیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب راوی حضرت مغیرہؓ کے الفاظ صراحتاً نقل کررہے ہیں تو فیصلہ ان الفاظ پر کیا جائے گا نہ کہ اس تأثر پر جو ان الفاظ سے راویوں نے لیا، یا اس تعبیر پر جو ''روایت بالمعنیٰ'' Indirect Narration میں انہوں نے اختیار کی۔

پھر دوسری اہم ترین بات یہ ہے کہ حافظ ابن جریرؒ نے یہ روایت جس سند کے ساتھ نقل کی ہے، وہ اول سے آخر تک شیعہ یا کذاب اور جھوٹے راویوں پر مشتمل ہے۔

اس روایت کا پہلا راوی ہشام بن الکلبی ہے، جو مشہور راوی محمد بن السائب کا بیٹا ہے، اس کے بارے میں ابن عساکرؒ کا قول ہے کہ:

رافضی لیس بثقة۔ (لسان المیزان: ١٩٦/٦)

ترجمہ: وہ رافضی ہے، ثقہ نہیں۔

اور حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ ابن ابی طی نے اسے امامیہ (شیعوں کا ایک فرقہ) میں شمار کیا ہے، اور

ابن ابی یعقوب حریمیؒ فرماتے ہیں کہ:

"راوية للمثالب غاية"

ترجمہ: انتہا درجے کی مثالب روایت کرتا ہے۔

پھر دوسرا راوی ابومخنف لوط بن یحییٰ ہے، اس کے بارے میں حافظ ابن عدی فرماتے ہیں:

"شيعي محترق صاحب أخبارهم"(لسان الميزان: ١٩٧/٦).

ترجمہ: جلا بھنا شیعہ ہے اور انہی کی روایت کا ذکر کرتا ہے۔

تیسرا راوی مجاہد بن سعید ہے، ان کے ضعیف ہونے پر تو تمام ائمہ حدیث کا اتفاق ہے ہی، یہاں تک کہ تاریخی روایات میں بھی انہیں ضعیف مانا گیا ہے۔ امام یحییٰ بن سعید قطان کے کوئی دوست کہیں جارہے تھے، انہوں نے پوچھا کہاں جارہے ہو"؟ انہوں نے کہا: "وہب بن جریر کے پاس جارہا ہوں، وہ سیرت کی کچھ کتابیں اپنے باپ سے بواسطہ مجالد سناتے ہیں۔" یحییٰ بن سعید نے فرمایا "تم بہت جھوٹ لکھ کر لاؤ گے"۔ (ابوحاتم الرازی، کتاب الجرح والتعدیل، ۳۶/۴، قسم اول دائرۃ المعارف، دکن، ۱۳۷۲ھ، تہذیب التہذیب: ۴۰/۱۰، ۱۳۲۶ھ)۔ اس کے علاوہ شیخ کا قول ہے کہ "یہ شیعہ ہے۔" (میزان العتدال: ۴۳۸/۳)۔

چوتھے راوی فضیل بن خدیج ہیں، ان کے بارے میں حافظ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ابوحاتم کا قول ہے کہ فضیل بن خدیج اشتر کے غلام سے روایت کرتا ہے، مجہول ہے، اور جو راوی اس سے روایت کرتا ہے وہ متروک ہے۔ (میزان الاعتدال: ۳۳۴/۲ ولسان المیز ان: ۴۵۳/۴) ان کے علاوہ دو راوی جن کا ذکر ابومخنف نے کیا ہے، یعنی صقعب بن زہیر اور فضیل بن خدیج تو سرے سے مجہول ہی ہیں[1]۔

---

[1] صقعب بن زہیر کو اگرچہ امام ابوزرعہ نے ثقہ قرار دیا ہے مگر ان کے بارے میں ابوحاتم رازی فرماتے ہیں: شیخ لیس بمشہور، الجرح والتعدیل، ۴۵۵/۲، قسم: ۱، اور فضیل کے بارے میں کہتے ہیں کہ هو مجهول روى عنه رجل متروك الحديث. (۷۲/۳)

اب آپ غور فرمائے کہ جس روایت کے تمام راوی از اول تا آخر شیعہ ہوں، ان میں سے بعض نے مقصد ہی یہ بنا رکھا ہو کہ صحابہ کرامؓ کی طرف بری بھلی باتیں منسوب کریں، کیا ایسی روایت کے ذریعے حضرت معاویہؓ یا حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی طرف کوئی الزام عائد کرنا سراسر ظلم نہ ہوگا؟ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ: ''میں نے قاضی ابوبکر العربی اور علامہ ابن تیمیہؒ کی کتابوں پر اعتماد کرنے کے بجائے خود تحقیق کر کے آزادانہ رائے قائم کرنے کا راستہ اس لئے اختیار کیا ہے کہ ان بزرگوں نے اپنی کتابیں شیعوں کی رد میں لکھی ہیں، لہذا ان کی حیثیت ''وکیل صفائی'' کی سی ہوگئی ہے''۔

اب مولانا مودودی صاحب خود ہی انصاف فرمائیں کہ کیا یہ غیر جانبداری کا تقاضہ ہے کہ ''وکیل صفائی'' کی بات تو سنی ہی نہ جائے، خواہ وہ کتنی ثقہ، قابل اعتماد اور قابل احترام شخصیت ہو، اور دوسری طرف ''مدعی'' کی بات کو بے چون وچراں تسلیم کر لیا جائے، خواہ وہ کتنا ہی جھوٹا اور افترا پرواز ہو؟ قاضی ابوبکر بن عربیؒ اور ابن تیمیہؒ (معاذ اللہ) حضرت علیؓ کے دشمن نہیں، صرف معاویہؓ کے ثقہ دوست ہیں، دوسری طرف ہشام بن الکلبی اور ابومخنف حضرت معاویہؓ کے کھلے دشمن ہیں۔ اور ان کی افترا پروازی نا قابل تردید دلائل کے ساتھ ثابت ہے، یہ آخر غیر جانبداری کا کون سا تقاضا ہے کہ پہلے فریق کی روایات سے صرف ان کے ''حب معاویہ'' کی وجہ سے یکسر پرہیز کیا جائے اور دوسرے فریق کی روایات پر ان کے ''بغض معاویہ'' کے باوجود کوئی تنقید ہی نہ کی جائے؟

مولانا مودودی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> بعض حضرات تاریخی روایات کو جانچنے کے لئے اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں راویوں کو ائمہ رجال نے مجروح قرار دیا ہے، .... یہ باتیں کرتے وقت یہ لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ محدثین نے روایات کی جانچ پڑتال کے یہ طریقے دراصل احکامی احادیث کے لئے اختیار کیے ہیں

........الخ۔

پھر آگے لکھتے ہیں:

اس لئے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ابن سعد، ابن عبدالبر، ابن کثیر، ابن جریر، ابن حجر اوران جیسے دوسرے ثقہ علماء نے اپنی کتابوں میں جو حالات مجروح راویوں سے نقل کئے ہیں انہیں رَدّ کر دیا جائے............الخ۔ (ص ۳۱۷ تا ۳۱۹)

یہاں سب سے پہلے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاریخی روایات میں سند کی جانچ پڑتال کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور جو روایتیں ان مؤرخین نے اپنی کتابوں میں درج کردی ہیں انہیں بس آنکھ بند کر کے قبول ہی کر لینا چاہئے تو آخران حضرات نے تقریباً ہر روایت کے شروع میں سند کو نقل کرنے کی زحمت ہی کیوں اٹھائی؟ کیا اس طرزِ عمل کا واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ روایات کی صحت وسقم کی ذمہ داری اپنے قارئین اور محققین پر ڈال رہے ہیں کہ مواد ہم نے جمع کر دیا، اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اسے تحقیق وتنقید کی کسوٹی پر پرکھو اور اہم نتائج اخذ کرنے کے لئے صرف ان روایات پر بھروسہ کرو جو تحقیق وتنقید کے معیار پر پوری اُترتی ہوں۔ ورنہ اگر تاریخی روایات کے معاملے میں ''اسماء الرجال کی کتابیں کھول کر بیٹھ جانے'' کی ممانعت کر دی جائے، تو خدارا مولانا مودودی صاحب یہ بتلائیں کہ ابن جریر نے جو یہ نقل کیا ہے حضرت داؤد علیہ السلام (معاذ اللہ) ''اوریا'' کی بیوی پر فریفتہ ہو گئے تھے، اس لئے اسے متعدد خطرناک جنگی مہمات پر روانہ کر کے اسے مروا دیا، پھر اس کی بیوی سے شادی کر لی اسے رَدّ کر دینے کی آخر کیا وجہ ہے؟ نیز ابن جریرؒ نے جو اپنی تاریخ میں بے شمار متعارض احادیث نقل کی ہیں، ان میں ترجیح آخر کس بنا پر دی جاسکے گی؟

تطویل سے بچنے کے لئے ہم اس بحث کو یہاں چھوڑتے ہیں کہ حدیث اور تاریخ کے درمیان معیارِ صحت کے اعتبار سے کیا فرق ہے؟ ہم چونکہ یہاں خاص اس روایت کے بارے میں گفتگو کر رہے

ہیں جس سے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے برسرِ منبر حضرت علیؓ کی مذمت کیا کرتے تھے، اس لئے مختصراً یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ روایت کیوں نا قابل قبول ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ تاریخ اور حدیث کے فرق کو ملحوظ رکھنے کے باوجود مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر مولانا کو بھی تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ روایت قطعی طور پر نا قابل اعتماد ہے:

۱۔ اس کے راوی سارے کے سارے شیعہ ہیں اور کسی روایت سے جو صرف شیعوں سے منقول ہو حضرت معاویہؓ پر طعن کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

۲۔ اس کے تمام راوی ضعیف یا مجہول ہیں، اور ایسی روایت تاریخ کے عام واقعات کے معاملے میں تو کسی درجے میں شاید قابل قبول ہوسکتی ہو، لیکن اس کے ذریعے کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہوسکتی جس سے کسی صحابی کی ذات مجروح ہوتی ہو۔

۳۔ یہ روایت درایت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی، اس لئے کہ اگر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت معاویہؓ کے حکم سے سات سال سے زائد مدت تک منبروں پر کھڑے ہوکر حضرت علیؓ پر ''سبّ وشتم کی بوچھار'' کرتے رہے تو:

الف۔ اس ''سبّ وشتم'' کی روایت کرنے والے تو بے شمار ہونے چاہئیں، یہ صرف ایک شخص ہی اس کی روایت کیوں کر رہا ہے؟ اور ایک بھی وہ جو شیعہ ہے اور اس کا جھوٹا ہونا معروف ہے؟

ب۔ کیا پوری امتِ اسلامیہ اپنے ''خیر القرون'' میں ایسے اہلِ جرأت اور اہلِ انصاف سے قطعی طور پر خالی ہوگئی تھی جو اس ''مکروہ بدعت'' سے حضرت معاویہؓ اور ان کے گورنروں کو روکتے، کیا حضرت حجر بن عدی کے علاوہ کوئی باغیرت مسلمان کوفہ میں موجود نہیں تھا؟

ج۔ عدالت و دیانت کا معاملہ تو بہت بلند ہے، حضرت معاویہؓ کے عقل وتدبر اور سیاسی بصیرت سے تو ان کے دشمنوں کو بھی انکار نہیں ہوگا، کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان جیسا صاحب فراست انسان

محض بغض کے جذبات میں بہہ کر ایک ایسا بے فائدہ اقدام کرے جو اس کی حکومت کے استحکام کے لئے خطرہ بن سکتا ہے؟ کوفہ حضرت علیؓ کے معتقدین کا مرکز تھا، کیا حضرت معاویہؓ ان کے سامنے حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کروا کر یہ چاہتے تھے کہ حضرت علیؓ کی وفات کے بعد بھی اہلِ کوفہ سے برابر لڑائی ٹھنی رہے، اور وہ کبھی دل سے حضرت معاویہؓ کے ساتھ نہ ہوں؟ کوئی گھٹیا سے گھٹیا سیاست دان بھی کبھی یہ نہیں کر سکتا کہ اپنے مخالف قائد کے مرنے کے بعد اس قائد کے معتقدین کے گڑھ میں بلا وجہ اسے گالیاں دیا کرے۔ ایسا کام وہی شخص کر سکتا ہے جسے لوگوں کو خواہ مخواہ اپنی حکومت کے خلاف بھڑکانے کا شوق ہو۔

ان وجوہ کی بناء پر یہ روایت تو قطعی طور پر ناقابل قبول ہے، دوسری روایت جس کا حوالہ مولانا نے دیا ہے البدایہ والنہایہ کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

ولما كان (مروان) متوليا على المدينة لمعاوية كان يسب علياً كل جمعة على المنبر، وقال له الحسن بن على: لقد لعن الله أباك الحكم وأنت فى صلبه على لسان نبيه فقال: لعن الله الحكم وما ولد، والله اعلم. (البداية والنهاية: ٨/ ٢٥٩)

ترجمہ: جب مروان مدینہ منورہ میں حضرت معاویہؓ کا گورنر تھا، اس وقت وہ ہر جمعہ کو منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کیا کرتا تھا، اور اس سے حضرت حسن بن علیؓ نے فرمایا کہ تیرے باپ حکم پر اللہ نے اپنے نبیؐ کی زبان سے اس وقت لعنت کی تھی جب تو اس کی صلب میں تھا، اور یہ کہا تھا کہ: حکم اور اس کی اولاد پر خدا کی لعنت ہو۔

اگرچہ یہ روایت کئی وجہ سے مشکوک ہے[1]۔ لیکن اتنی بات کچھ اور روایتوں سے بھی مجموعی طور پر

---

[1] اول تو اس لیے کہ یہ پوری عبارت البدایہ والنہایہ کے اصل مصری نسخہ میں موجود نہیں ہے، دوسرے اس لیے کہ اس کے آخر میں آنحضرت کی طرف جو الفاظ منسوب کیے گئے ہیں وہ بہت مشکوک ہیں۔

معلوم ہوتی ہے کہ مروان بن الحکم مدینہ منورہ کی گورنری کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کچھ ایسے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا جو حضرت علیؓ کو محبوب رکھنے والوں کو ناگوار گزرتے تھے، لیکن یہ نازیبا الفاظ کیا تھے؟ ان تاریخی روایتوں میں سے کسی میں ان کا ذکر نہیں، البتہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ایک واقعہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ:

ان رجلاً جاء الی سهل بن سعد فقال : هذا فلان لأمير المدينة يدعو علياً عندالمنبر ، قال : فيقول ماذا؟ قال يقول له : أبو تراب، فضحک وقال: والله ماسماه الا النبی صلی الله عليه وسلم وما كان له اسم أحب اليه منه [1]

ایک شخص حضرت سہلؓ کے پاس آیا اور بولا کہ امیر مدینہ منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ کو سبّ و شتم کرتا ہے، حضرت سہلؓ نے پوچھا وہ کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا کہ: انہیں ''ابوتراب'' کہتا ہے۔ حضرت سہلؓ ہنس پڑے اور فرمایا: خدا کی قسم اس نام سے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پکارا ہے اور آپ کے نزدیک ان کا اس سے پیارا نام کوئی نہ تھا۔

اگر یہاں ''امیر مدینہ'' سے مراد مروان ہی ہے، جیسا کہ ظاہر یہی ہے تو اس ''سبّ وشتم'' کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے۔ ابوتراب کے معنی ہیں ''مٹی کا باپ'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کو محبت میں اس نام سے پکارا کرتے تھے، مروان زیادہ سے زیادہ اسے اس کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتا ہوگا۔ اگر فرض کیجئے کہ مروان اس سے بھی زیادہ کچھ نازیبا الفاظ حضرت علیؓ کی شان میں استعمال کرتا تھا تو آخر یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ وہ یہ کام حضرت معاویہؓ کے حکم سے کرتا تھا؟ مولانا نے البدایہ کی جس عبارت کا حوالہ دیا ہے، اس میں بھی کہیں یہ مذکور نہیں کہ حضرت معاویہؓ نے اسے اس کام کا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب مناقب علیؓ

حکم دیا تھا یا وہ اس کے اس فعل پر راضی تھے، ایسی صورت میں یہ الفاظ لکھنے کا کوئی جواز ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت معاویہؓ خود اور ان کے حکم سے ان کے تمام گورنر خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سبّ وشتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔

مندرجہ ذیل بالا بحث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ:

۱۔ خود حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سبّ وشتم کی جو نسبت مولانا نے کی ہے، اس کا تو کوئی ادنیٰ ثبوت بھی مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں، بلکہ کہیں نہیں ہے، اور اس کے برعکس حضرت معاویہؓ سے حضرت علیؓ کی تعریف وتوصیف کے جملے منقول ہیں۔

۲۔ اسی طرح ''تمام گورنر'' کا جو لفظ مولانا نے استعمال کیا ہے، وہ بھی بالکل بلا دلیل ہے، مولانا کے بیان کردہ حوالوں میں صرف دو گورنروں کا ذکر ہے۔

۳۔ ان دو گورنروں میں سے ایک یعنی مروان بن الحکم کے بارے میں مولانا کے دیئے ہوئے حوالے کے اندر یا اور کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے حضرت علیؓ پر سبّ وشتم کیا کرتا تھا۔

۴۔ ''سبّ وشتم کی بوچھاڑ'' کا لفظ بھی بلا دلیل ہے، اس لئے کہ مولانا کے دیئے ہوئے حوالے میں تو ''سبّ وشتم'' کے الفاظ منقول نہیں، صحیح بخاری کی روایت سے جو الفاظ معلوم ہوتے ہیں انہیں ''سبّ وشتم'' کھینچ تان کر ہی کہا جا سکتا ہے۔

۵۔ دوسرے گورنر حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کے بارے میں مولانا نے حوالہ صحیح دیا ہے، لیکن ساتھ ہی اس میں یہ تصریح ہے کہ وہ قاتلینِ عثمانؓ کے لئے بددعا کیا کرتے تھے، دوسرے یہ روایت از اوّل تا آخر سارے کے سارے شیعہ راویوں سے مروی ہے اور روایت ودرایت ہر اعتبار سے واجب الرد ہے۔

ماخوذ از: حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق: ۳۶ تا ۵۱

یزید کی ولی عہدی کا مسئلہ

مولانا محمد تقی عثمانی

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ پر ایک مشہور اعتراض یہ ہے کہ انہوں نے یزید کو اپنا ولی عہد نامزد کیا۔......

اس موضوع پر اپنی گفتگو شروع کرنے سے قبل ہم ابتداء ہی میں ہم یہ بات صاف کر دینا چاہتے ہیں کہ یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں۔

۱۔حضرت معاویہ کا یزید کو ولی عہد بنانا رائے، تدبیر اور نتائج کے اعتبار سے صحیح تھا یا غلط؟

۲۔دوسرے یہ کہ حضرت معاویہؓ نے یہ کام نیک نیتی کے ساتھ جواز شرعی کی حدود میں رہ کر کیا تھا یا خالص اپنے ذاتی مفاد کے لئے حدود اللہ کو پامال کر کے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اس میں ہمیں مولانا مودودی صاحب سے اختلاف نہیں ہے، جمہور امت کے محقق علماء ہمیشہ یہ کہتے آئے ہیں کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا یہ فعل رائے اور تدبیر کے درجے میں نفس الامری طور پر درست نہیں ثابت ہوا، اور اس کی وجہ سے امت کے اجتماعی مصالح کو نقصان پہنچا، لہذا اگر مولانا مودودی صاحب اپنی بحث کو اسی حد تک محدود رکھتے تو ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

البتہ مولانا سے ہمارا اختلاف دوسرے مسئلے میں ہے، مولانا نے حضرت معاویہؓ کے اس قدام کو محض رائے اور تدبیر کے اعتبار سے غلط قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ براہ راست حضرت معاویہؓ کی نیت

پر تہمت لگا کر اس بات پر اصرار فرمایا ہے کہ ان کے پیش نظر بس اپنا ذاتی مفاد تھا، اور اس ذاتی مفاد پر انہوں نے پوری امت کو قربان کر دیا۔

جمور امت کا موقوف اس معاملے میں یہ ہے کہ حضرت معاویہؓ کے اس فعل کو بلحاظ تدبیر و رائے تو غلط کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی نیت پر حملہ کرنے اور ان پر مفاد پرستی کا الزام عائد کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے، لہذا ہماری آئندہ گفتگو کا حاصل یہ نہیں ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ اقدام واقعے کے اعتبار سے سو فیصد درست اور نفس الامر میں بالکل صحیح تھا یا انہوں نے جو کیا وہ بالکل ٹھیک کیا، بلکہ ہماری گفتگو کا موضوع یہ ہے کہ وہ اپنے اس اقدام میں نیک نیت تھے، انہوں نے جو کچھ کیا وہ نیک نیتی کے ساتھ اور شرعی جواز کی حدود میں رہ کر کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یزید کی ولی عہدی اور خلافت کا مسئلہ ہمارے زمانے میں بڑی نازک صورت اختیار کر گیا ہے، اس مسئلے پر بحث و مباحثہ کی گرم بازاری نے مسلمانوں میں دو ایسے گروہ پیدا کر دئے ہیں جو افراط و تفریط کی بالکل آخری حدود پر کھڑے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو یزید کو کھلا فاسق و فاجر قرار دے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ پر مفاد پرستی، خود غرضی، رشوت ستانی اور ظلم و عدوان کے الزامات عائد کر رہا ہے، دوسری طرف ایک گروہ ہے جو یزید کو فرشتہ قرار دے کر حضرت حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیر جیسے جلیل القدر صحابہ کو ہوس اقتدار، جاہ طلبی اور انتشار پسندی کا مجرم بنا رہا ہے، اور جمہور امت نے اعتدال کا جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ مناظرے کے جوش و خروش میں دونوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

اس افراط و تفریط کی ساری وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے باہمی اختلافات کو موجودہ زمانے کی سیاسی پارٹیوں کے اختلافات پر قیاس کر لیا گیا ہے اور چونکہ آج کی مفاد پرست دنیا میں یہ تصور مشکل ہی سے آتا ہے کہ دو مخالف سیاسی جماعتیں بیک وقت نیک نیتی کے ساتھ کسی صحیح، جائز اور نیک مقصد کے لئے

ایک دوسرے سے لڑسکتی ہیں، اس لیے صحابہ کرامؓ کی جماعتوں کے بارے میں بھی یہ تصور کرنا مذکورہ گروہوں کو مشکل نظر آتا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ وہ سرسری طور پر کسی ایک جماعت کے برحق اور نیک نیت ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، اور یہ فیصلہ ذہن میں جما کر اس کی تائید وحمایت کے لئے دلائل تلاش کرتے ہیں، اور اس سلسلے میں دوسرے فریق کے صحیح موقف کو سمجھنے کی کوشش کئے بغیر اس پر الزامات واعتراضات کی بوچھار شروع کردیتے ہیں......۔

ہم اس مسئلے میں اپنے مطالعہ کا حاصل پیش کرتے ہیں:

یہاں تین چیزیں قابل غور ہیں۔

۱۔ ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ یزید خلافت کا اہل تھا یا نہیں؟

۳۔ ان روایات کی کیا اصلیت ہے جن میں یزید کی بیعت کے لئے خوف وطمع کے ذرائع سے کام لینے کا ذکر کیا گیا ہے؟

ہم مسئلے کے ان تینوں گوشوں پر مختصر گفتگو کرتے ہیں۔

ولی عہد بنانے کی شرعی حیثیت

یہاں دو مسئلے قابلِ تحقیق ہیں: ایک یہ کہ کوئی خلیفۂ وقت اپنے بعد کے لئے کسی کو خاص طور سے اپنے کسی رشتہ دار کو اپنا ولی عہد بنادے تو اس کی یہ وصیت امت پر لازم ہوجاتی ہے یا اس کی وفات کے بعد اہل حل وعقد کی منظوری کی پابند رہتی ہے؟

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے، اس بات پر امت کا اجماع منعقد ہوچکا ہے کہ خلیفہ وقت اگر کسی شخص میں نیک نیتی کے ساتھ شرائط خلافت پاتا ہے تو اس کے لئے جائز ہے کہ وہ اس کو ولی عہد بنادے، خواہ وہ اس کا باپ، بیٹا یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، البتہ بعض علماء نے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر وہ اس کا باپ یا

بیٹا ہوتو اہل حل وعقد کے مشورے کے بغیر ولی عہد بنانا بھی جائز نہیں ہے۔

رہا دوسرا مسئلہ تو اس میں علامہ ماوردی، شاہ ولی اللہ اور ابن خلدون کے بیانات سے تو بڑے توسعات معلوم ہوتے ہیں، ان کا رجحان اس طرف ہے کہ اگر کوئی خلیفہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنا دے جس میں خلافت کی اہلیت ہو تو اس کی وصیت ساری امت پر لازم ہو جاتی ہے، اور اس کا نفاذ اہل حل وعقد کی مرضی پر موقوف نہیں ہوتا، لیکن علمائے محققین کی رائے یہی ہے کہ ولی عہد بنانے کی حیثیت ایک تجویز کی سی ہوتی ہے، اور جب تک امت کے ارباب حل وعقد اسے منظور نہ کرلیں، یہ تجویز اامت پر واجب العمل نہیں ہوتی، خواہ کتنی نیک نیتی کے ساتھ کی گئی ہو، بلکہ امت کے ارباب حل وعقد کو حق ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو باہمی مشورے سے اس تجویز کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کردیں، اسلامی سیاست کے مشہور عالم اور مصنف قاضی ابویعلیٰ الفراء الحنبلیؒ (متوفی ۴۵۸ھ) تحریر فرماتے ہیں:

> خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنے بعد کے لئے کسی شخص کو ولی عہد بنائے، اور اس معاملے میں اہل حل وعقد کی موجودگی کوئی ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد بنایا، اور حضرت عمر نے چھ صحابہ کرامؓ کو یہ فریضہ سپرد کیا، اور سپرد کرتے وقت کسی نے بھی اہل حل وعقد کی موجودگی کو ضروری نہیں سمجھا۔ اس کی عقلی وجہ یہ ہے کہ کسی کو ولی عہد بنانا اس کو خلیفہ بنانا نہیں ہے، ورنہ ایک ہی زمانے میں دو خلفاء کا اجتماع لازم آجائے گا جو جائز نہیں ہے، اور جب یہ خلافت کا عقد نہیں ہے تو اہل حل وعقد کی موجودگی بھی ضروری نہیں، ہاں ولی عہد بنانے والے کی وفات کے بعد ان کی موجودگی ضروری ہے۔

چند سطروں کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> خلیفہ کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو ولی عہد بنائے جو اس کے ساتھ باپ

یا بیٹے کا رشتہ رکھتا ہو، بشرطیکہ وہ خلافت کی شرائط کا حامل ہو، اس لئے کہ خلافت محض ولی عہد بنانے سے منعقد نہیں ہو جاتی بلکہ مسلمانوں کے قبول کرنے سے منعقد ہوتی ہے، اور اس وقت ہر تہمت دور ہو جاتی ہے۔(ابو یعلیٰ الفراء، الأحکام السلطانیۃ، ص:۹، مصطفیٰ البابی الحلبی ،مصر ۱۳۵۶ھ)۔

محقق علماء کے نزدیک صحیح بات یہی ہے کہ اگر خلیفہ وقت بھی اپنی مرضی سے کسی کو ولی عہد بنا دے تو اس کے لئے یہ تو جائز ہے، لیکن اس کا یہ فیصلہ ایک تجویز کی حیثیت رکھتا ہے جسے امت کے اہل حل وعقد اس کی وفات کے بعد قبول بھی کر سکتے ہیں اور رد بھی۔ دلائل کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے، مختصر یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو ولی عہد تو بلاشبہ بنایا تھا، لیکن بنانے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی اہل شوریٰ سے استصواب فرمایا اور جب دیکھا کہ تمام لوگ ان پر متفق ہیں تب اپنے فیصلے کا اعلان فرمایا۔(ملاحظہ ہو: طبری،۲/۶۱۸) نیز ان کی وفات کے بعد بھی امت ان پر متفق ہو گئی۔

اس تفصیل سے دو باتیں بہر حال واضح ہو جاتی ہیں۔

۱۔ اگر کوئی خلیفۂ وقت نیک نیتی کے ساتھ اپنے بیٹے کو خلافت کا اہل سمجھتا ہے تو وہ اسے اپنا ولی عہد مقرر کر سکتا ہے، یہ بات علماء کے ان دونوں گروہوں کے نزدیک متفق علیہ ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

۲۔ علمائے محققین کے نزدیک بیٹے کو ولی عہد بنانے کے لئے ارباب حل وعقد سے مشورہ کرنا اور ان کا منظور کرنا ضروری ہے، اس کے بغیر اس کی خلافت منعقد نہیں ہوتی، اور یہی قول صحیح ومختار ہے، البتہ ایک جماعت اس بات کی بھی قائل رہی ہے کہ خلیفہ وقت تنہا اپنی مرضی سے اپنے بیٹے کو ولی عہد بنا سکتا ہے، اس سلسلے میں اہل حل وعقد کی منظوری کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور اس کی وصیت تمام امت پر لازم ہو جاتی ہے۔

اب یزید کی ولی عہدی کے مسئلے پر غور فرمائیے، مندرجہ بالا احکام کی روشنی میں یہ بات اچھی طرح

واضح ہوجاتی ہے کہ اگر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دیانت داری سے اپنے بیٹے یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے تو اسے ولی عہد بنادینا شرعی اعتبار سے بالکل جائز تھا۔ اگر وہ یہ کام پوری امت کے مشورے سے کرتے تب تو بالاتفاق ان کا یہ فیصلہ ہر فرد کے لئے واجب الاتباع ہوتا، اور اگر تنہا اپنی رائے سے کرتے تو ان کے فعل کی حد تک تو یہ فیصلہ باتفاق جائز تھا اور علماء کے ایک گروہ کے نزدیک امت کے لئے واجب العمل بھی تھا، لیکن علماء کے راجح قول کے مطابق اس سے اہل حل وعقد کی منظوری کے بغیر یزید کی خلافت منعقد نہیں ہوسکتی تھی۔

اب مسئلہ یہ رہ جاتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے یزید کو خلافت کا اہل سمجھ کر ولی عہد بنایا تھا یا محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے؟

کیا حضرت معاویہؓ یزید کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے؟

واقعہ یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پوری دیانت داری اور نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل ہے، متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ حضرت عثمان کے صاحبزادے حضرت سعید بن عثمانؓ نے آ کر حضرت معاویہؓ سے شکایت کی کہ '' آپ نے یزید کو ولی عہد بنادیا ہے، حالانکہ میرا باپ اس کے باپ سے، میری ماں اس کی ماں سے اور خود میں اس سے افضل ہوں۔'' حضرت معاویہؓ نے فرمایا کہ '' خدا کی قسم! تمہارے والد مجھ سے بہتر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تھے، تمہاری ماں بھی یزید کی ماں سے افضل ہے، لیکن جہاں تک یزید کا تعلق ہے، اگر سارا غوطہ تم جیسے آدمیوں سے بھر جائے تو بھی یزید تم سے بہتر اور زیادہ محبوب ہوگا۔'' حضرت معاویہؓ کے یہ الفاظ بتارہے ہیں کہ وہ کسی ذاتی برتری کے تصور یا رشتے کی بنا پر یزید کو افضل نہیں سمجھ رہے تھے بلکہ ان کی دیانت دارانہ رائے یہی تھی۔ اس کے علاوہ متعدد تواریخ میں منقول ہے کہ انہوں نے ایک خطبے میں یہ دعا فرمائی کہ:

اللّٰهم ان كنت تعلم انی وليته لأنه فيما أراه أهل لذالک فأتمم له

ماوليته وان كنت لوليته لأني أحبه فلا تتم له ما وليته.(البداية والنهاية: ٨/ ٨٠)

ترجمہ: اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ میں نے اسے (یزید کو) اس لیے ولی عہد بنالیا ہے کہ وہ میری رائے میں اس کا اہل ہے تو اس ولایت کو اس کے لئے پورا فرمادے، اور اگر میں نے اس لئے اس کو ولی عہد بنایا ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے تو اس ولایت کو پورا نہ فرما۔

اور حافظ شمس الدین ذہبی اور علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے عطیہ بن قیس کے حوالے سے اس دعا کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں:

اللّٰهم ان كنت عهدت ليزيد لما رأيت من فضله فبلغه ما أملت وأعنه وان كنت انما حملني حب الوالد لولده وأنه ليس لما صنعت به أهلاً فاقبضه قبل أن يبلغ ذلك.(الذهبي: تاريخ الاسلام: ٢/ ٢٦٧، والسيوطي: تاريخ الخلفا: ١٥٧).

ترجمہ: اے اللہ! اگر میں نے یزید کو اس کی فضیلت دیکھ کر ولی عہد بنایا ہے تو اسے اس مقام تک پہنچادے جس کی میں نے اس کے لئے امید کی ہے، اور اس کی مدد فرما۔ اور اگر مجھے اس کام پر صرف اس محبت نے آمادہ کیا ہے جو باپ کو بیٹے سے ہوتی ہے تو اس کے مقام خلافت تک پہنچنے سے پہلے اس کی روح قبض کرلے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ جس باپ کے دل میں چور ہو، کیا وہ جمعہ کے دن مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر قبولیت کی گھڑی میں اپنے بیٹے کے لئے ایسی دعا کرسکتا ہے؟ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس پُرخلوص دعا کے بعد بھی اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ انہوں نے یزید کو نااہل سمجھنے کے باوجود محض بیٹا

ہونے کی وجہ سے خلافت کے لئے نامزد کیا تھا تو یہ اتنا بڑا تحکم ہے جس کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہے۔ کسی شخص کی نیت پر حملہ کرنا زندگی میں بھی شریعت نے جائز نہیں قرار دیا، چہ جائیکہ اس کی وفات کے ساڑھے تیرہ سو برس بعد اس ظلم کا ارتکاب کیا جائے۔

یزید کی جو مکروہ تصویر عموماً ذہنوں میں بسی ہوئی ہے اس کی بنیادی وجہ کربلا کا المناک حادثہ ہے، ایک مسلمان کے لئے واقعۃً یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ جس شخص پر کسی نہ کسی درجے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب نواسے کے قتل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسے صالح اور خلافت کا اہل قرار دیا جائے۔ لیکن اگر حقیقت حال کی واقعی تحقیق مقصود ہو تو اس معاملے میں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ جس وقت یزید کو ولی عہد بنایا جا رہا تھا اس وقت حادثۂ کربلا واقع نہیں ہوا تھا اور کوئی شخص یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یزید کی حکومت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا جائے گا۔ اس وقت یزید کی شہرت جھوٹوں کو بھی اس حیثیت سے نہیں تھی جس حیثیت سے آج ہے۔ اس وقت تو وہ ایک صحابی اور ایک خلیفۂ وقت کا صاحبزادہ تھا۔ اس کے ظاہری حالات، صوم وصلاۃ کی پابندی، اس کی دنیوی نجابت اور اس کی انتظامی صلاحیت کی بنا پر یہ رائے قائم کرنے کی پوری گنجائش تھی کہ وہ خلافت کا اہل ہے، اور صرف یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے نہیں تھی بلکہ بہت سے دوسرے جلیل القدر صحابہ اور تابعین بھی یہ رائے رکھتے تھے۔ دوسری صدی ہجری کے مشہور مؤرخ علامہ بلاذری مورخ مدائنی کے حوالے سے امام المفسّرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ نقل کرتے ہیں:

قال عامر بن مسعود الجمحی أنا بمكة اذ مربنا يزيد ينعى معاوية فنهضنا الى ابن عباس وهو بمكة وعنده جماعة وقد وضعت المائدة ولم يؤت بالطعام، فقلنا له، يا ابن عباس! جاء البريد بموت معاوية، فوجم طويلا ثم قال: اللّٰهم أوسع لمعاوية ، أما والله ما كان مثل من قبله

ولايأتي بعده مثله وان ابنه يزيد لمن صالحي أهله فالزموا مجالسكم وأعطوا طاعتكم وبيعتكم .(البلاذري: انساب الاشراف: ۴۰۳)

ترجمہ: عامر بن مسعود جمحی کہتے ہیں کہ: جب ایک قاصد حضرت معاویہ کی وفات کی خبر لے کر آیا تو ہم مکہ مکرمہ میں تھے، ہم اٹھ کر حضرت ابن عباس کے پاس چلے گئے، وہ بھی مکہ ہی میں تھے، ان کے پاس کچھ لوگ بیٹھے تھے اور دستر خوان بچھ چکا تھا، مگر ابھی کھانا نہیں آیا تھا۔ ہم نے ان سے کہا کہ اے ابن عباس! قاصد حضرت معاویہ کی موت کی خبر لے کر آیا ہے، اس پر وہ کافی دیر خاموش بیٹھے رہے، پھر انہوں نے کہا کہ یا اللہ! حضرت معاویہؓ کے لئے اپنی رحمت وسیع فرما دے، خدا کی قسم! وہ اپنوں سے پہلوں کی طرح نہیں تھے، اور ان کے بعد ان جیسا نہیں آئے گا، اور بلاشبہ ان کا بیٹا یزید ان کے صالح اہل خانہ میں سے ہے، لہذا اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو اور اپنی طاعت اور بیعت اسے دے دو۔

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت محمد بن حنفیہ کے بارے میں حافظ ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ فتنہ حرہ کے موقع پر عبداللہ بن مطیع اور ان کے ساتھی حضرت محمد بن حنفیہ کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ: ''یزید شراب پیتا ہے اور نماز چھوڑتا ہے، اور کتاب اللہ کے احکام سے تجاوز کرتا ہے'' اس کے جواب میں حضرت محمد بن حنفیہؒ نے فرمایا:

قد حضرته وأقمت عنده فرأيته مواظبا على الصلاة متحريا للخبر يسأل عن الفقه ملازماً للسُّنة.(البداية والنهاية: ۸/ ۲۳۳)

ترجمہ: میں اس کے پاس گیا ہوں اور ٹھہرا ہوں، میں نے اس کو نماز کا پابند اور خیر کا طالب پایا، وہ فقہ کے مسائل پوچھتا ہے اور سنت کا پابند ہے۔

انہوں نے کہا کہ: ''یزید نے آپ کے سامنے تصنعاً ایسا کیا ہوگا''، حضرت محمد بن حنفیہ نے فرمایا کہ: ''اسے مجھ سے کون سا خوف یا کون سی امید تھی'' اور کیا اس نے تمہیں خود بتایا ہے تو تم بھی اس کے شریک ہوگے، اور اگر اس نے تمہیں نہیں بتایا تو تمہارے لئے حلال نہیں ہے کہ بغیر علم کے شہادت دو۔'' انہوں نے کہا کہ: ''اگر چہ ہم نے دیکھا نہیں لیکن ہم اس خبر کو سچ سمجھتے ہیں''، حضرت محمد بن حنفیہ نے فرمایا: ''اللہ نے شہادت دینے والوں کے لئے ایسی بات کہنے کو جائز قرار نہیں دیا، قرآن کا ارشاد ہے: ''**الامن شهد بالحق وهم يعلمون** ''لہذا مجھے تمہارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے،'' انہوں نے کہا: ''شاید آپ یہ بات پسند نہیں کرتے کہ اس معاملے (یزید کے خلاف بغاوت) کی سرداری آپ کے سوا کسی اور کو ملے، لہذا ہم آپ ہی کو اپنا سردار بنالیتے ہیں'' حضرت محمدؒ نے فرمایا کہ: ''میں قتال کو نہ تابع ہو کر حلال سمجھتا ہوں نہ قائد بن کر''۔

ان روایات سے یہ بات واضح ہے کہ یزید کے ظاہری حالات ایسے تھے کہ ان کی موجودگی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ جیسے صحابی اس کے صالح اور اہل خلافت ہونے کی رائے رکھ سکتے تھے۔ دوسری طرف اگر اس ماحول کو پیش نظر رکھا جائے جس میں یہ خلافت منعقد ہو رہی تھی تو بلاشبہ یہ رائے قائم کرنے کی بھی پوری گنجائش تھی کہ وہ موجودہ حالات میں خلافت کا اہل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جس ماحول میں حضرت حسین، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسے جلیل القدر صحابی صلحائے امت اور مدبرین موجود ہوں اس ماحول میں یزید کو خلافت کے لئے نااہل یا غیر موزوں سمجھنا کچھ بعید نہیں ہے، زمانۂ صحابہ کرام اور کبار تابعین کا تھا، امت میں خیر وصلاح کا دور دورہ تھا، ایسے حالات میں خلافت کے لئے عدالت وتقوی کے جس معیار بلند کی ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ یزید اس پر پورا نہیں اترتا تھا، اسی لئے بعض صحابہ کرامؓ نے اس نامزدگی کی کھل کر مخالفت کی۔

تیسرے صحابہ کرامؓ کا ایک گروہ وہ تھا جو حضرت حسینؓ اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ جیسے صحابہ کے مقابلے میں یزید کو خلافت کے لئے بہتر تو نہیں سمجھتا تھا، لیکن اس خیال سے اس کی خلافت کو گوارا کر رہا تھا کہ امت میں افتراق وانتشار برپا نہ ہو، مثلاً حمید بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ: میں یزید کی ولی عہدی کے وقت حضرت بشیر کے پاس گیا جو صحابہ میں سے تھے، تو انہوں نے فرمایا:۔

یقولون انما یزید لیس بخیر أمة محمد صلی الله علیه وسلم وأنا أقول ذلک، ولٰکن لأن یجمع الله اُمّة محمد أحب الیّ من أن تفترق.(ذهبی:تاریخ الاسلام: ۲/۲۶۷)

ترجمہ: لوگ کہتے ہیں کہ یزید امت محمدؐ میں سب سے بہتر نہیں ہے۔ اور میں بھی یہی کہتا ہوں، لیکن امت محمد کا جمع ہو جانا مجھے افتراق کی بہ نسبت زیادہ پسند ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یزید کے بارے میں صحابہ کرام کا یہ اختلاف بھی درحقیقت رائے اور اجتہاد کا اختلاف تھا، اور اس معاملے میں کسی کو بھی مطعون نہیں کیا جا سکتا، حضرت معاویہ یزید کو محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اسے خلافت کا اہل سمجھنے کی وجہ سے ولی عہد بنانا چاہتے تھے، اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت دیانت داری کے ساتھ ان کی ہم نوا تھی، اور وہ پانچ صحابہ کرام جنھوں نے اس کی مخالفت کی تھی، وہ کسی ذاتی خصوصیت یا حرص اقتدار کی بناء پر مخالفت نہیں کر رہے تھے، بلکہ وہ دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے کہ یزید خلافت کا اہل نہیں ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

یزید کے بارے میں لوگوں کے دو فریق ہیں، اور کچھ لوگ بیچ کی رائے رکھتے ہیں، بعض لوگوں کا اعتقاد تو یہ ہے کہ وہ صحابہ وخلفائے راشدین یا انبیاء میں تھا، یہ اعتقاد بالکل باطل ہے، اور کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ...... اس کا اصل مقصد اپنے کا فرشتہ

داروں کا بدلہ لینا تھا، یہ دونوں قول باطل ہیں، ہر عقل مند انسان ان اقوال کو باطل سمجھے گا۔

اس لئے کہ یہ شخص (یزید) مسلمان بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ اور شاہی طرز کے خلفاء میں سے ایک خلیفہ تھا، نہ وہ ایسا تھا (جیسے پہلے گروہ نے کہا) اور نہ ویسا (جیسا دُوسرے گروہ نے کہا)۔'' [ابن تیمیہ: منہاج السنۃ، ۲/۲۴۶، ۲۴۷]

اور علامہ ابن خلدونؒ لکھتے ہیں:

حضرت معاویہؓ کے دل میں دوسروں کو چھوڑ کر اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے کا جو داعیہ پیدا ہوا، اس کی وجہ امت کے اتحاد و اتفاق کی مصلحت تھی، بنو اُمیہ کے اہل حل وعقد اس پر متفق ہو گئے تھے، کیونکہ وہ اس وقت اپنے علاوہ کسی اور پر راضی نہ ہوتے، اور اس وقت قریش کی سربرآوردہ جماعت وہی تھی اور اہل حکومت کی اکثریت انہی میں سے تھی، اس لئے حضرت معاویہؓ نے اس کو ترجیح دی اور افضل سے غیر افضل کی طرف رجوع کیا........ حضرت معاویہؓ کی عدالت اور صحابیت اس کے سوا کچھ اور گمان کرنے سے مانع ہے۔ [ابن خلدون، مقدمہ: ۳۷۷]

ماخوذ از: حضرت معاویہ اور تاریخی حقائق، ص: ۱۱۲ تا ۱۲۸